مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا-

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ______ لاہور

خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25 بی گلبرگ- 2 لاہور 54660 ٹیلی فون: 876219 فیکس: 92-42-876219

فہرست مشمولات

لمعات (پہلا قدم)	ادارہ	2
احتساب خویش	بانی تحریک	10
استحکام ملت (بیاد اقبالؒ)	علامہ محمد اقبالؒ	13
کیا نیچر کے ماننے سے خدا معطل ہو جاتا ہے	سرسید احمد خان	16
اللہ- انسان اور ارض	ڈاکٹر بشیر الحق	18
حقوق یا فرائض	محترمہ ثریا عندلیبؒ	20
رزق کی تقسیم	مصطفیٰ شان	23
حکمرانوں کی شاہ خرچیاں	ڈاکٹر صلاح الدین اکبر	24
نقد و نظر	ادارہ	26
حقائق و عبر	ادارہ	32
موت کا اک دن معین ہے؟	محمد عمر دراز	36
صورت گری	محمد جیلانی قریشی	39
یہ تبلیغی جماعتیں	مزمل حسین بخاری	43
موت کا اک دن معین ہے؟	ڈاکٹر انجم اقبال فریدی	45
چبھتے سوال	محمد شبیر احمد خان	50
Intrest & Riba	سراجدین احمد	64

انتظامیہ:- چیئرمین: ایاز حسین انصاری -- ناظم: محمد لطیف چوہدری
مدیر مسئول: محمد لطیف چوہدری -- مجلس ادارت: میجر محمد یوسف ڈار- محمد عمر دراز -- ناشر: عطاء الرحمٰن ارائیں
طابع: خالد منصور نسیم -- مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز 3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور-
مقام اشاعت: 25-B گلبرگ 2 لاہور- 54660

جلد 48 | شمارہ 11 | نومبر 1995ء

بدل اشتراک

اندرون ملک سالانہ 120 روپے
ایشیا' افریقہ' یورپ 550 روپے
آسٹریلیا' امریکہ' کینیڈا 750 روپے
فی پرچہ =/10 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پہلا قدم

نومبر 1984ء کا ذکر ہے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ پاکستان ٹیلی وژن کی فرمائش پر' اپنا انٹرویو ریکارڈ کروانے' ٹیلی وژن سٹیشن تشریف لے گئے۔ انٹرویو سے قبل آپ VIP روم میں تشریف فرما تھے۔ سامنے میک اپ روم تھا۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر اور راقم بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ لاہور ٹیلی وژن سٹیشن کے جنرل مینجر جناب نثار حسین صاحب نے دورانِ گفتگو سوال کیا کہ پرویزؒ صاحب! اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے جو کچھ شروع میں کہا' آج تک اسی پر قائم ہیں۔ اس لمبے عرصے میں نہ آپ کی سوچ میں تبدیلی آئی نہ آپ کے مسلک میں فرق آیا۔ پرویزؒ صاحب نے برجستہ کہا۔ نثار صاحب میں نے کبھی میک اپ نہیں کیا۔ میں نے حق کو اپنایا اور اسے بے کم وکاست بیان کرتا چلا آرہا ہوں۔

ہو سکتا ہے بعض قارئین پرویزؒ صاحب کی بیان کردہ اس حقیقت سے آگاہ نہ ہوں کیونکہ طلوع اسلام کی بنیاد کی اینٹیں بہت سارے احباب کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہیں اور ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ماہنامہ طلوع اسلام۔ کب' کیسے اور کس مقصد کے لئے جاری ہوا تھا۔ اس قسم کے استفسارات کا خود کوئی جواب دینے کی بجائے ہم ماہنامہ طلوع اسلام کا سب سے پہلا اداریہ جو مئی 1938ء میں شائع ہوا' قارئین کے سامنے لا رہے ہیں تاکہ وہ جان سکیں کہ طلوع اسلام کب' کیسے اور کس مقصد کے لئے معرض وجود میں آیا تھا۔ اس سے قارئینِ کرام اس بات کا بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ طلوع اسلام نے جو کچھ پہلے دن کہا تھا وہ آج بھی اسی طرح وقت کی پکار اور دین کا تقاضا ہے۔ جس عظیم مقصد کے لئے یہ پرچہ وجود میں آیا تھا آج بھی اسی مقصد کے لئے وقف ہے۔ زندگی بھر نہ بانیٔ تحریک طلوع اسلام نے اپنا نصب العین بدلا نہ ان کے بعد ان کے شاگردوں میں سے کسی ایک کو ایسا کرنے کی جرأت ہوئی۔

ورق الٹئے! کچھ دیر کے لئے ہم آپ کو 1938ء میں لئے چلتے ہیں۔ مدیر مسئول

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مئی 1938ء

خاک ماخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

ایک کمزور و ناتواں' غریب و نادار بھکاری کی یہ حالت تھی کہ بچارا صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا۔ ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو بمشکل اتنا پاتا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکے۔ کبھی اتنا بھی نہ ملتا تو فاقہ کاٹتا۔ اس کی ساری عمر یونہی بسر ہو گئی۔ وہ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اسے اس کی جھونپڑی میں ہی دفن کر دیا جائے۔ جب اس کی قبر کھودی گئی تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے وقتوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔ بھکاری کی تباہ حال زندگی اور یہ خزانہ----- لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

بھکاری اور خزانہ کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے آپ کو سب سے نادار۔ ہر ایک کا دست نگر سمجھ رکھا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کر دے۔

بھکاری کے دکھ کا علاج اسے ایک پیسہ خدا کی راہ میں دیدینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا۔ بلکہ اس کی سچی مدد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس کے خزانہ کا پتہ دیدیتا۔ آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرا دیا جائے جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے۔ یہ متاعِ گراں بہا قرآنِ کریم ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا !!

آپ کہیں گے کہ مسلمان قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے ترجمے سنتے ہیں۔ تفسیروں کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت کرتے ہیں اور کیا چاہئے؟ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآنِ کریم کی حفاظت یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت قائم رکھنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن محض حفاظت اور عقیدت تو مقصود بالذّات نہیں۔ قرآنِ کریم کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے۔ اور یہ دعویٰ خود قرآنِ کریم ہی پر مبنی ہے کہ خدائے حیّ و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ایک مکمل دستور

العل' ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے لئے خضرِ راہ ہے۔ مسلمان کی تو زندگی ہی اس میں تھی کہ وہ ہر ایک قدم اٹھانے سے پیشتر اس امر کا جائزہ لے کہ وہ اپنا قدم اسی جادۂ مستقیم پر لے جا رہا ہے' جسے قرآنِ کریم نے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی مدنیت و عمرانیت۔ معاش و معاشرت۔ مذہب و سیاست غرضیکہ ہر مسئلۂ حیات کا حل اسی ایک نظام کی رُو سے ہونا چاہئے۔ اس کے تمام افکار و تخیّلات۔ اس کے تمام رجحاناتِ قلبی و ذہنی۔ اس کے تمام تصوراتِ دینی و دنیاوی۔ سب کی تشکیل اسی ایک سانچے میں ہونی چاہئے۔ اس کے پاس حقائق کے پرکھنے کا معیار ہو تو یہی اور صداقتوں کے ماپنے کا پیمانہ ہو تو یہی۔ یہ سُنے تو اس کی مدد سے۔ دیکھے تو اس کی روشنی میں۔ سمجھے تو اس کی بصیرت سے۔ اور اس طرح یہ اس ایک دروازے پر جھک کر ساری دنیا کے دروازوں سے مستانہ وار بے نیاز گزرتا جائے۔

آپ جس مسلمان سے پوچھئے۔ وہ بلاتکلّف کہدیگا کہ الحمد للہ میرا بھی یہی ایمان ہے لیکن کیا آج ہو بھی یہی رہا ہے۔ کیا مسلمانوں کی زندگی کا عملی حل قرآنِ کریم سے ہی تلاش کیا جاتا ہے !!! کیا ان کا دستور العمل واقعی خدا کا یہ آخری پیغام ہے۔ !!!

اس کا جواب اپنے گرد و پیش نظر دوڑا کر خود اپنے آپ سے لیجئے۔

لیکن اس تصویر کا اس سے بھی زیادہ بھیانک پہلو ایک اور ہے۔ یہ حفاظت و عقیدت کی بنیاد پر قرآنِ کریم سے لگاؤ کونسے مسلمانوں کو ہے۔ کیا انہی کو نہیں جو اب قصۂ ماضی بننے والے ہیں۔ لیکن ذرا اس طبقہ پر نگاہ ڈالئے جو کل کو اُمّتِ مسلمہ۔ ملّتِ اسلامیہ کہلانے والا ہے۔ یعنی آج کے نوجوانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ۔ جانے والے مسلمانوں نے اس فضا میں پرورش پائی جہاں پھر بھی کچھ نہ کچھ مذہب کا چرچا تھا۔ لیکن یہ آنے والے مسلمان اس ماحول کے تربیت یافتہ ہیں جہاں اور سب کچھ ہے لیکن خدا اور رسول کا ذکر نہیں۔ ذرا کسی نوجوان مسلمان تعلیم یافتہ کے مکان پر جایئے۔ دنیا بھر کا لٹریچر اس کی الماریوں میں ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ملے گا تو قرآنِ کریم کا نسخہ۔ وہ اپنے بچوں کو بڑے فخر سے آپ کے سامنے لائے گا۔ یہ بتانے کے لئے کہ یہ اتنی سی عمر میں کس طرح فرفر انگریزی بولتے ہیں۔ یہ قابلِ تحسین بات ہے۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ بیٹا ! کلمہ بھی آتا ہے تو وہ آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے کہ یہ کس دیس کی بولی بولتا ہے۔ !

پھر آپ اِن کی درسگاہوں میں جایئے اور دیکھئے کہ وہاں مذہب سے بیگانگی ہی نہیں بلکہ نفرت پیدا کرنے کے کس قدر سامان موجود ہیں۔ نتیجہ اِن تمام اثرات کا یہ ہے کہ آپ کی قوم کے نوجوان۔ مسلمانوں کا سا نام تو

رکھتے ہیں، کہ اس پر انہیں اختیار نہ تھا۔ اور اب تو نام کو بھی اس انداز سے مروڑتے ہیں کہ اس سے شناخت ہی نہ ہو سکے کہ آپ کس مِلّت سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کے قلب و دماغ کی تعمیر یکسر غیر اسلامی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ جو ذرا متین و سنجیدہ ہوں گے وہ دل ہی دل میں مذہب کے خلاف بغاوت کی آتشِ خاموش سلگاتے رہیں گے۔ جو بزعمِ خویش آزاد قسم کے ہوں گے۔ وہ علانیہ تمسخر اڑائیں گے۔ پھبتیاں کسیں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ وہ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ان کا قصور نہیں۔ قصور سب ہمارا ہے کہ ایک طرف ہم نے انہیں مذہب سے ناآشنا رکھا۔ اور دوسری طرف ان کو تعلیم اس لہجے پر دلائی جس میں مذہب کے خلاف سرکشی کے تمام سامان موجود تھے۔ اور جہاں کہیں مذہب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا وہ اس انداز کا تھا کہ اس سے ان کی بیگانگی اُلٹی نفرت سے بدل جائے۔

لیکن ذرا تصوّر میں لائیے اس وقت کو کہ جب آپ نہ ہوں گے اور انہی نوجوانوں کی جماعت کا نام مسلمانوں کی قوم ہو گا۔ مفادِ اسلامی کے تحفظ کے لئے آپ کی ہر کوشش لائقِ صد تحسین۔ لیکن سوچئے تو سہی کہ جن کی خاطر آپ یہ تحفظ کے سامان پیدا کر رہے ہیں ان کی نگاہ میں آپ کے اسلام اور اس کے مفاد کی کوئی وقعت بھی ہے! غور فرمایئے کہ کہیں آپ اس نیام کی پرداخت میں تو مصروف نہیں جس کے اندر تلوار لکڑی کی ہے۔ !!

بایں ہمہ نوجوانوں سے مایوس ہو جانے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے نوجوان بہت کم ملیں گے جنہیں اگر صحیح اسلام سے رُوشناس کرا دیا جائے تو پھر بھی وہ اپنی لادینی پر مصر ہوں۔ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ آنے والی قوم مذہب سے متنفر ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہوں نے پچھلے دنوں چند صاحبِ ہمت۔ درد مند مسلمانوں کے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوتِ غور و فکر دی، جن کی اکثریت نوجوانوں ہی پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور و تدبّر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ بڑی بڑی سکیموں۔ شاندار پروگراموں۔ تہلکہ انگیز تحریکوں کو چھوڑیئے۔ وقت وہ آگیا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں "ایک ایک دو دو کر کے ہی خدا کے لئے اُٹھ کھڑے ہو۔ پھر سوچو" کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اس کی متاعِ گم گشتہ، اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلّہ شائع کیا جائے جو مِلّتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کا نقیب ہو۔ اور ان کی مِلّی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآنِ کریم کی روشنی میں پیش کرے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح

کر سکے کہ قرآنِ کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑ کر چلا جائے' خدا کا یہ پیغام ازلی وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ اور جب ساری دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تو اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے۔ عدم سکون و فقدانِ اطمینان کی اس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹ رہی ہے' وہی نظام کارفرما ہو گا جو قرآن کی دقتین کے اندر محفوظ ہے۔ اور جس کے سوا اور کوئی نظام فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتا کہ یہ نظام خود خالقِ فطرت کا متعین فرمودہ ہے۔

پھر خدا کے اس پیغام ازلی کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی اُنگلیاں ملّتِ اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے مقیاس پر ہوں۔ اور ان کا اسلوبِ بیان اس درجہ دلکش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوقِ ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کریں تو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اور جب وہ اُنہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دے کہ فی الواقع قرآنِ کریم خدا کی کتاب ہے اور نوع انسانی کی ہر مشکل کا حل' ذہنِ انسانی کی ہر سطح کے مطابق اس کے اندر موجود ہے۔

رسائل کے اجراء میں سب سے بڑا جاں گسل اور جگر گداز مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ اقتصادی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں اور خریداروں کی کمی سے رسالہ اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتا۔ جو رسالہ اپنے اجراء سے پیشتر اس مشکل کا حل تجویز کر رکھتا ہے وہی چل سکتا ہے۔ ورنہ شروع سے ہی خریداروں کے آسرے پر جینے کی توقع کرنے والے پرچے کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ------ ہر قدم پر یہ گماں کہ یاں رہ گیا---- واں رہ گیا۔ چنانچہ اس مشکل کا حل پہلے سوچ لیا گیا ہے۔ اس جماعت کے ہر رکن نے ایک متعین رقم ادا کر کے اتنا سرمایہ فراہم کر دیا ہے کہ جو رسالہ کے خسارہ کا کفیل ہو سکے اور انہوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک رسالہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا نہ ہو جائے وہ اس خسارہ کو پورا کرتے رہیں گے۔ اور اس کے منافع میں سے ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں لیں گے۔

لہٰذا یہ پرچہ ایک فرد کی بجائے ایک جماعت کا پرچہ ہو گا۔ اور یہی جماعت اس کی مالک و مختار ہو گی۔

اس جماعت کا ہر رکن اس کا محافظ و نگراں ہو گا۔ کہ اس کے ساتھ اس کا قلبی تعلق وابستہ ہے۔ لیکن یہ جس متعین مسلک کا آئینہ دار ہو گا اس میں کسی فرد کو دخل نہ ہو گا۔ تمام امور باہمی مشاورت اور قرآنِ کریم کے نظام کے ماتحت سرانجام پائیں گے۔ جو حضرات اس امدادی پروگرام میں عملی حصہ لینا چاہیں، وہ اس کی تفصیل دریافت فرمائیں۔ اگر یہ سلسلہ وسیع ہو گیا تو کیا عجب کہ یہی ننھا سا پودا ایک دن ایک بار آور۔ تناور درخت بن جائے **كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ** اس شجرِ طیب کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔

دورِ حاضرہ کے مسلمانوں کی انتہائی خوش بختی ہے کہ انہیں آج مسائلِ حیات کا حل قرآنی روشنی میں تلاش کرنے کے لئے کچھ زیادہ جگر کاری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ڈوبتی ہوئی قوم میں ایک ایسی گراں قدر ہستی کو پیدا کیا ہے جس نے اپنے دل و دماغ کی بہترین متاع کو تمام عمرانی مسائل کے حل میں صرف کر دیا۔ اور اس کے نتائج کا درخشندہ موتیوں کی طرح' بلا مُزد قوم کے سامنے انبار لگا دیا۔ یہ بیش بہا خزانہ آج "کلامِ اقبال" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پرچہ کی خوش نصیبی ہے کہ پیامِ اقبال کی نشرواشاعت اس کا مقصد ہو گا۔ آج ملّتِ اسلامیہ کی زندگی کا راز اس "پیام" کے اندر ہے کہ یہ پیام دراصل قرآنِ کریم کا پیام ہے۔ حضرت علّامہ مدظلہ العالی کی باریک بیں اور دُور رس نگاہیں حقائقِ قرآن کے سمجھنے میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہیں، اُن سے کوئی دیدہ ور ناواقف نہیں۔ ملّتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے۔

سابقہ طلوعِ اسلام کا نام بھی حضرت علّامہ کا ہی تجویز کردہ تھا۔ اور اس کا مسلک بھی یہی تھا۔ جن زہرہ گداز مشکلات کے ماتحت اس پرچہ کی اشاعت بند ہوئی، ان کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں البتہ اس کے بند ہونے کی وجہ سے ملّتِ اسلامیہ کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اس کے احساس کا اظہار تو مجبوراً ہو جاتا ہے۔ گذشتہ "یومِ اقبال" کی ترتیب کے سلسلہ میں جب دہلی کا قافلہ' حضرت علّامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں بھی طلوعِ اسلام کے احیا کے لئے متردّد پایا۔

ان حالات کے پیشِ نظر اس پرچہ کا نام بھی "طلوعِ اسلام" ہی رکھا گیا ہے۔ اربابِ معنی کے نزدیک تو گویا یہ سابقہ طلوعِ اسلام کا ہی دورِ جدید ہے۔ حضرت نذیر نیازی (مدیر سابقہ طلوعِ اسلام) کا اس باب میں اعلان آپ دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ان کی عقیدت و توجہات اسی طرح اس پرچہ کے شاملِ حال رہیں گی جیسی ان کے اپنے پرچہ کے ساتھ تھیں اور یہ بھی ہے کہ یہ پرچہ بھی کسی غیر کا

نہیں ہے۔ یہ تو ملّتِ اسلامیہ کے ہر درد رکھنے والے مسلمان کی مشترکہ متاع ہے۔ یہ تو محض انتظامی معاملات اور ذمہ داریوں کی کفالت کی بناء پر ہے جو اسے اس جماعت کا پرچہ کہا جائے گا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ سابقہ طلوعِ اسلام کے خریداران اور بہی خواہان اسے اپنا ہی پرچہ تصور فرمائیں۔

پھر ہماری خوش بختی ہے کہ ہندوستان کے ممتاز اہل الرائے اور اہلِ قلم حضرات کی ایک جماعت کی توجیہات و عنایات ہمارے شامل حال ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات کی نہ صرف قلمی اعانت ہی ہمیں رہینِ منّت کریگی بلکہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگہی ہر مسئلہ میں ہمارے لئے شمعِ ہدایت ہو گی۔ اس ضمن میں منجملہ دیگر حضرات۔ جناب مولانا اسلم جیراجپوری مدظلّہ، شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب قبلہ۔ جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مدیر ترجمان القرآن) ڈاکٹر تصدّق حسین صاحب خالد۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بارایٹ لاء۔ جناب محمد اسد خان صاحب۔ اسد ملتانی صاحب جناب راجہ حسن اختر صاحب۔ پی۔ سی۔ ایس۔ خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر ممتاز اسلامی مفکّرین کی توجیہات کو مرکوز کرنے کے لئے پوری کوششوں سے کام لیا جائیگا۔ جن حضرات نے "متنوعات" کے ذیل میں مختصر عنوان مستقلاً" اپنے لئے منتخب کئے ہیں ان کی ندرتِ فکر۔ وسعتِ نظر اور اصابتِ رائے۔ اربابِ ذوق کے نزدیک مسلم ہے۔ انتظامی معاملات کے متعلق اتنا کہدینا ہی کافی ہو گا کہ جن حضرات کے ہاتھوں میں اس کا نظم و نسق ہے ان کی وسعت تجربہ بجائے خویش ایک متاع گراں ہے۔ اور ان کی دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

لیکن یہ تمام انتظامات۔ اور ان سے متعلقہ مساعی۔ یہ تمام تدابیر اور ان کی جز رسی۔ یہ ولولے اور یہ ارادے یہ تجاویز اور ان کی تکمیل کے لئے کوششیں۔ یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع۔ یہ سب انسانی دماغوں کی تخلیق ہیں۔ جو نہ غلطیوں سے مبرا ہیں نہ سہو اور فروگذاشت سے منزّہ۔ جنہیں نہ کل کے آنے والے واقعات کا علم ہے۔ نہ اس پر تصرف و قدرت! لہٰذا یہ تمام انسانی کوششیں پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتیں اگر اس خدائے حیّ و قیوم کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو کہ موت و حیات، کامیابی و ناکامی، فلاح و خُسران اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی اعانت شریک کار ہو تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش اور کمزور سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کر دے کہ بڑے سے بڑے ساز و سامان رکھنے والے انگشت بدنداں رہ جائیں اور اگر وہی شاملِ حال نہ ہو تو دنیا بھر کی قوتیں اور ان کا ہجوم ایک ذرّہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اس لئے بھروسہ نہ اپنی تدابیر و تجاویز پر ہے، نہ قوت و استعداد پر۔ بھروسہ فقط اس کی ذات پر ہے جو ہر کمزور اور

ناتوان کا حقیقی آسرا اور ہر نحیف و نزار کا یقینی ملجا ہے۔ بازار مصر میں ایک ضعیفہ کی سُوت کی انٹی یقیناً ہر صاحبِ دولت و حشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے لیکن چہ عجب کہ اس کے دربار میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اسی انٹی کی قیمت دولت کونینِ سے بڑھ جائے۔ ردّ و قبول تو اس کی مشیّت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شانِ استغناء میں ترحّم خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسّم پیدا کر دے۔ کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو اور اس کے ساتھ یہ اُمنگیں اور یہ ولولے! بہرحال جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے لیکر اس شاہنشاہِ گدا نواز کے آستانے پر حاضر ہو رہے ہیں اس التجا کے ساتھ کہ

کوہِ آتش خیز کن ایں کاہ را ز آتش ما سوز غیر اللہ را
رہرواں را منزلِ تسلیم بخش قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

ان دعاؤں اور ان التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اس کے راستہ میں اٹھایا جا رہا ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ط

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بڑھاپا

"حکیم جی رات بھر کھانسی اٹھتی رہتی ہے۔ پسلیاں دکھ جاتی ہیں۔ ایک منٹ کیلئے سونا نہیں ملتا"۔
"بڑے میاں یہ بڑھاپا ہے"۔ حکیم جی نے کہا۔
"حکیم جی ! بھوک قطعاً" بند ہے۔ دو لقمے کھا لیتا ہوں تو چھاتی پر بوجھ بنے رہتے ہیں"۔
"بڑے میاں ! یہ بڑھاپا ہے"۔
"حکیم جی ! بینائی کم ہو رہی ہے۔ اب سنائی بھی اونچا دیتا ہے۔ اٹھتا ہوں تو پاؤں لڑکھڑاتے ہیں"۔
"بڑے میاں۔ بڑھاپا ہے۔"
"تجھے کس پاجی نے حکیم بنا دیا۔ گدھا کہیں کا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ کہدیتا ہے بڑھاپا ہے؟
"بڑے میاں ! یہ بھی بڑھاپا ہے"۔ حکیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احتسابِ خویش

(بانیٔ تحریک کا پیغام وابستگانِ تحریک کے نام)

عزیزانِ گرامی قدر! اب مجھے ان خارجی امور سے آگے بڑھ کر، اپنی داخلی دنیا کی طرف آنا چاہیئے قرآنِ کریم نے اہل کتاب کے پیشوایان مذہب کے متعلق کہا تھا کہ

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

(2/44)

تمہاری حالت یہ ہے کہ لوگوں کو تو بھلائی کی تلقین کرتے ہو، لیکن خود وہ کچھ نہیں کرتے جو دوسروں سے کہتے ہو۔ حالانکہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم کتابِ خداوندی کا اِتباع کرتے ہو۔ تم اگر ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اِتباعِ کتاب کا پہلا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ خود تمہاری اپنی اصلاح ہو۔ لیکن تم ہو کہ دوسروں کی اصلاح کے پیچھے تو لٹھ لئے پھرتے ہو، لیکن اپنی اصلاح کی کوئی فکر ہی نہیں کرتے۔

عزیزانِ من! ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ کیا قرآنِ کریم کا یہی اعتراض خود ہم پر تو وارد نہیں ہوتا؟ میں نے جہاں تک حالات کا جائزہ لیا ہے۔ ہم میں بیشتر احباب ایسے ہیں کہ قرآنی فکر ان کے دماغ تک تو پہنچی ہے لیکن ان کے قلب میں نہیں اُتری۔ قرآن کے الفاظ میں------ **وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ**--- یاد رکھیئے! قرآنِ کریم کا حقیقی مقصد، انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک قرآنی فکر انسان کے قلب کی گہرائیوں تک نہ اُترے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت لطیف نکتہ کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ بعض جرائم ایسے ہیں جو معاشرہ میں بالبداہت معیوب قرار دیئے جاتے ہیں---- مثلاً شراب نوشی، قمار بازی، فحش کاری وغیرہ---- اس قسم کے جرائم سے مُجتنب رہنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن فقط ان سے اجتناب سے سیرت و کردار میں تبدیلی نہیں آجاتی۔ ہم اپنے بچپن کی غلط تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات سے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیاں (Complexes) اور تحت الشعوری

گرہیں (Inhibitions) لے کر پروان چڑھتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ وہ **شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ** تو اس سے مُراد یہ ہے کہ وہ ان تمام نفسیاتی عوارض کو دور کر کے ایک متوازن شخصیت (Balanced Personality) اُستوار کر دیتا ہے۔ سیرت و کردار کی بلندی' متوازن شخصیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ محسوس جرائم--- شراب نوشی' قمار بازی' فحش کاری وغیرہ سے مجتنب رہنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس میں تو خود سوسائٹی کی نظروں میں گر جانے کا خیال بھی روک تھام کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن نفسیاتی پیچیدگیاں اور تحت الشعوری عوارض' وہ غیر محسوس شیاطین ہیں جو انسان کے خون میں حلول کئے ہوتے ہیں۔ اِنہیں وہاں سے نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اور جب تک یہ نہ نکلیں' اِنسان کی سیرت میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک غیر مُتوازن شخصیت کس طرح خود بھی جہنم میں رہتی ہے اور اپنے وابستگانِ دامن کو بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھتی ہے' اس کا تجربہ ہمارے گھروں کی زندگی اور نجی محفلوں سے لگ سکتا ہے۔ ایسے لوگ آپ کی نگاہ میں ہوں گے جن میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند ہوں گے۔ لیکن اتنی سی بات سے کہ انہیں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں انہوں نے اپنے گھر کو جہنم اور دوستوں کی محفل کو "ضیق النفس" کا مریض بنا رکھا ہو گا۔ یہ کیا ہے؟ وہی نفسیاتی پیچیدگی' جو تحت الشعور میں جاگزین ہے۔ ایسے لوگ' شراب خوری اور فحش کاری کو تو جُرم (گناہ) سمجھتے ہیں، لیکن اس قسم کی کمزوریوں کو اپنی "عادت" کہہ کر خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم ان نفسیاتی عوارض کا علاج کر کے' انسانی شخصیت کو متوازن بنا دیتا ہے۔ اس بات کے پرکھنے کا معیار (کہ کسی کی شخصیت کس حد تک متوازن ہو چکی ہے) یہ ہے کہ اس میں (علیٰ حدِّ بشریّت) صفاتِ خداوندی کا انعکاس کس حد تک ہوتا ہے۔ اسی کو خدا کے رنگ میں رنگے جانا کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں صفات خداوندی (الاسماء الحُسنیٰ) کا تذکرہ اس اصرار و تکرار کے ساتھ آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ ہماری سیرت کے پرکھنے کا نہایت واضح خارجی معیار بن سکیں۔

سو' اے ہمصفیرانِ چمنستانِ قرآنی ! اگر ہماری شخصیت میں اس قسم کی تبدیلی نہیں آرہی' تو ہماری قرآن فہمی شاعری کی داد سے زیادہ کچھ نہیں۔ بلکہ اس کا نقصان یہ ہے کہ اس سے انسان اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں دوسروں کے مقابلہ میں بہت آگے ہوں۔ اور اس طرح اُن سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ جو اس فریب میں مبتلا ہو اسے سمجھ لینا

چاہئے کہ اسے قرآن کی بارگاہ سے کچھ بھی بہرہ نصیب نہیں ہوا۔ ہم اگر دوسروں سے آگے ہو سکتے ہیں تو صرف اپنی سیرت کی بلندی کی بنا پر ہو سکتے ہیں۔ محض طلوعِ اسلام کے مسلک سے متفق یا قرآنی فکر سے آشنا ہونے کے زعم پر دوسروں سے آگے اور اُونچے نہیں ہو سکتے۔ اس خیال خام کو دل سے نکال دیجئے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو ہم سے متفق نہیں وہ پاکیزگیٔ سیرت میں ہم سے آگے ہو۔ اس لئے آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ جو شخص طلوعِ اسلام سے متفق نہ ہو' آپ اس سے نفرت کرنے لگ جائیں۔ ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم قدم قدم پر اس امر کا جائزہ لیتے جائیں کہ ہمارے گھر کی زندگی میں جنّت کا سا سکون ہے یا نہیں۔ احباب کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کس حد تک خلوص و یگانگت ہے۔ دوسروں کے ساتھ معاملات میں ہماری دیانت و امانت کی کیا کیفیت ہے۔ جو عہد ہم نے اپنی تحریک کے ساتھ باندھا ہے' اس میں کس حد تک اُستواری اور وفا شعاری ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسروں کا دکھ درد بٹانے کے لئے ہمارے اندر کس حد تک ایثار و خود فراموشی کا مادہ ہے۔ اور ایسا کرنے کے بعد' ہمارا نفس کسی قسم کی نمود و ستائش کا متمنی تو نہیں۔ اگر آپ کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے تو قرانی فکر سے وابستگی آپ کے لئے نفع بخش ہے۔ اگر ایسا نہیں تو یہ محض تفریحِ طبع سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس صورت میں' لوگ بجا طور پر آپ کو یہ طعنہ دے سکیں گے کہ ؎

خزاں تو موردِ الزام ہی سہی' لیکن
بہ فیضِ بادِ صبا بھی تو گُل نہ کھلے

اور اگر آپ نے اپنے اندر اس قسم کی جنت آفریں تبدیلی پیدا کر لی ہے تو آپ بصد وجد و کیف' گُل کدۂ قرآنی سے کہہ سکیں گے کہ ؎

ابدی بادِ بہار تو کہ در انجمنت
کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رفتم

ڈسپلن

"تم نے اس فائل کو میرے گھر کیوں نہیں بھیج دیا؟ مفت میں اس قدر دیر کر دی۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

"جناب آپ نے اس دن فرمایا تھا کہ جب تک آپ نہ کہیں' کوئی کام گھر پر نہ بھیجا جائے"

"تم سامنے بولنے سے باز نہیں آتے؟ تمہاری زبان تمہارے قابو میں نہیں رہتی؟ تمہیں کب سلیقہ آئے گا؟" کلرک کے چلے جانے کے بعد میں نے ارشد سے کہا کہ تم نے کس قدر نامعقول بات کی ہے۔

اس نے جواب دیا۔ "ڈسپلن اسی طرح قائم رہتا ہے"

اسے کون بتائے کہ ڈسپلن بگڑتا ہی اس طرح سے ہے؟

ڈسپلن کا سرچشمہ دل کا احترام ہے اور احترام پیدا ہوتا ہے افسر کے کیریکٹر سے۔ نہ کہ نامعقولیت سے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ اقبالؒ

استحکامِ ملّت

(از افاداتِ قلم حضرت علّامہ اقبالؒ)

1799ء میں اسلام کا سیاسی زوال مکمل ہو گیا لیکن یہ اس کی اندرونی قوت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو اس کا فوراً ہی احساس بھی ہو گیا۔ اُنیسویں صدی میں سرسیّد احمد خان، سیّد جمال الدین افغانی اور مفتی عالم جان پیدا ہوئے۔ سیّد احمد خاں کی طرح مفتی عالم جان کا بھی یہی خیال تھا کہ رُوسی مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ سیّد جمال الدین کی ذات البتہ ان سے مختلف تھی۔ ان کی روح آج بھی دنیائے اسلام میں سرگرمِ کار ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی انتہا کہاں ہو گی۔

بہرکیف ان جلیل القدر ہستیوں کا خیال تھا کہ تین قوتیں ہیں جو دنیائے اسلام پر حاوی ہیں اور جن کا ازالہ اسلام کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ اول ملائیت جس نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ ثانیاً" ایک زوال پذیر تصوّف جس نے مسلمانوں کے اندر حقائقِ حیات کی بجائے طرح طرح کے اوہام اور ساقط العملی پیدا کر دی ہے اور ثالثاً" سلاطینِ اسلام جو اپنی ذاتی اغراض کے لئے قوم کو غیروں کے ہاتھ بیچتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ ان بلند مرتبت حضرات کی اصلاحی کوششوں سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ہاں ایک بات ظاہر ہے اور وہ یہ کہ زاغلول پاشا، مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ کا ظہور ایک حد تک انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے پیش رو مصلحین کا کام تعبیر و استدلال اور تشریح و توضیح کرنا تھا لیکن جن شخصیتوں کا ظہور اب ہوا ہے وہ اگرچہ علم میں ان سے بہت پیچھے ہیں مگر نہایت صحیح الفطرت، جو اگر ضرورت پیش آئے تو زور اور جبر سے کام لیکر بھی ان باتوں کو منوا سکتے ہیں جو دنیا کے موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگرچہ غلطیاں کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کی غلطیاں بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ مسلمانانِ عالم جدید خیالات سے متاثر ہوئے لیکن سیّد احمد خاں، سیّد جمال الدین افغانی اور ان کے ہزارہا شاگرد جنہوں نے اسلامی دنیا کی ذہنی اور روحانی فضا کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی تھی۔ افرنگی مآب مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ ان کی ساری تعلیم قدیم علما ہی کے زیرِنگرانی ہوئی تھی۔ لہٰذا ترکوں میں جو انقلاب رونما ہوا اور جس کا جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک میں ظاہر ہونا ضروری ہے، خود اسلام ہی کی اندرونی قوتوں کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان سے باہر تمام مسلمان اور بالخصوص ترک کیا واقعی اسلام کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی شخص کا مسلمان یا کافر ہونا ایک فقہی اور قانونی سوال ہے جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا اس کو اسلام کے بنیادی اصولوں کا

اقرار ہے؟ اگر کوئی شخص توحید اور ختمِ رسالت پر ایمان رکھتا ہے تو بڑے سے بڑا مُلّا بھی اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے پنڈت جی کے ذہن میں ان اصلاحات کا خیال ہو جو اتاترک مصطفیٰ کمال کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اندریں حالات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ترکوں کے مادی رجحانات فی الواقع اسلام کے منافی ہیں؟ ایک غیر مسلم کے لئے اس بات کا سمجھنا بہت مشکل ہے کہ مسلمانوں کے مادی رجحانات شعورِ ذات کی ایک صورت ہیں۔ اسلام کو ان رجحانات سے کوئی خطرہ نہیں۔ قرآنِ پاک کا صاف و صریح ارشاد ہے کہ "دنیا میں تمہارا جو حصہ ہے اسے مت چھوڑو۔" پھر کیا لاطینی رسم الخط کی ترویج یا قدیم لباس کا ترک اس بات کی دلیل ہے کہ تُرک اب مسلمان نہیں رہے حالانکہ بحیثیت ایک مذہب نہ اسلام کا کوئی وطن ہے نہ بحیثیت جماعت اس کی کوئی زبان۔ بالخصوص وضع قطع۔ قرآنِ پاک کو ترکی زبان میں تلاوت کرنے کی ایک مثال بھی اسلامی تاریخ میں موجود ہے۔ گو میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی شدید غلطی ہے اس لئے کہ غیر مغربی زبانوں میں سوائے عربی کے اور کسی کا مستقبل نہیں۔ اس ضمن میں تو اب یہ خبریں آنے لگی ہیں کہ ترکوں نے پھر عربی متن کو اختیار کر لیا ہے۔ ممکن ہے تعداد ازدواج کی تنسیخ یا علما کے لئے 'پروانوں' کا حصول اسلام کے خلاف قرار دیا جائے حالانکہ فقہ اسلامی کی رُو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر شریعت کی "اجازتوں" کو روک سکتا ہے بشرطیکہ اسے یقین ہو کہ لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ رہا علما کیلئے لائسنس یا پروانوں کا حاصل کرنا سو یہ ایک ایسی بات ہے کہ اگر حضرت شاہ ولی اللہؒ یا امام ابن تیمیہ آج زندہ ہوتے تو ان کا دل کس قدر خوش ہوتا۔ مشکوٰۃ میں ایک حدیث ہے کہ ایک اسلامی حکومت کا امیر یا اس کے مقرر کئے ہوئے لوگ ہی وعظ و تبلیغ کر سکتے ہیں۔ البتہ سویلین قانون کا اختیار کرنا ضرور ایک خطرناک غلطی ہے اور تُرکوں کی طرح تمام دنیائے اسلام کو ابھی اسلامی قانونِ وراثت کے نامعلوم معاشی پہلوؤں کو سمجھنا ہے۔ جو قرآنِ کریم کے نزدیک فقہ اسلامی کی ایک نہایت درجہ اچھوتی شاخ ہے۔ رہا تنسیخِ خلافت اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا مسئلہ سو اس کو سمجھنے کے لئے اول اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اسلام اور شہنشاہیت دو الگ اور مختلف چیزیں ہیں اور تُرکوں نے جس خلافت کو ختم کیا ہے یہ وہ نظامِ شہنشاہیت تھا۔ جو بنو اُمیّہ کے ساتھ وجود میں آیا۔ البتہ ادارہ خلافت کے متعلق ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اب عالمگیر خلافت کا قیام ممکن نہیں۔ مذہب اور ریاست کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایسا کرنے میں تُرکوں نے یورپ کا اتباع کیا ہے یا محض سیاسی اور دینی وظائف کی تقسیم مدنظر ہے، جیسا کہ دنیائے اسلام میں قاعدہ رہا ہے۔ بہرکیف یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اس بارے میں یورپ کی تقلید کریں گے، جس نے روح اور مادہ کو دو الگ الگ وجود قرار دے رکھا ہے۔

ترکوں کی ان اصلاحات کے بعد اب ہم ان وطنی اور نسلی تخیلات سے بحث کریں گے جو بقول پنڈت جواہر لال نہرو ایران اور ترکی میں کام کر رہے ہیں اور جن سے گویا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان ممالک میں اب اسلام کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تاریخ انسانی کا طالب علم اس امر سے خوب واقف ہے کہ اسلام کا ظہور اس وقت ہوا جب دنیا کی وہ تہذیبیں جن کا دارو مدار قرابت اور بادشاہ پرستی پر تھا مٹ

رتی تھیں- اسلام نے اتحادِ انسانی کی بنا گوشت اور پوست کے رشتوں پر نہیں رکھی بلکہ ان کے قلب و نفس پر- اندریں حالات اسلام نے انسان کو یہ پیغام دیا ہے "نسل پرستی کو چھوڑ دو ورنہ آپس کی لڑائیاں تمہیں ہلاک کر دیں گے" یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں کہ اسلام نے اپنے مخصوص ادارات سے کام لیتے ہوئے فطرت کی نسل سازیوں کو ہمیشہ شکست دینے کی کوشش کی ہے- چنانچہ اسلام کو جو کامیابی انسانوں کی ایک برادری تیار کرنے میں ہوئی ہے، بدھ مت یا مسیحیت کو دو ہزار برس میں بھی نہیں ہو سکی- کیا یہ ایک معجزہ نہیں کہ ایک ہندی مسلمان کو اختلافِ نسل اور اختلافِ زبان کے باوجود مراکش پہنچ کر بھی کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی؟ با ایں ہمہ اسلام نے نسل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کے ازالے کی طرف بتدریج قدم اٹھایا ہے- قرآن پاک کا ارشاد ہے "ہم نے تم کو شعوب و قبائل میں محض تعارف کے لئے تقسیم کیا ہے' خدا کے نزدیک بڑا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے"- لہٰذا نسل کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں اور اس سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں ان سے بچنے کی ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ہم اسلامی طریقِ عمل کو اختیار کرتے ہوئے نسلیت کو مٹانے کی کوشش کریں- مصطفیٰ کمال کے دل میں اگر اتحادِ توران کا جذبہ کام کر رہا ہے تو محض ایک سیاسی حربے کے طور پر اور میرے نزدیک یہ جواب ہے اتحادِ سلافیت' اتحاد المانویت یا اینگلو سیکسنت کا۔

جہاں تک وطنیت کا تعلق ہے اسلام نے کبھی اس جذبے کی مخالفت نہیں کی کہ انسان اپنے وطن سے محبت نہ رکھے- اسلام صرف اس وطنیت کا مخالف ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے- لیکن ترکی' ایران' مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اگر یہاں اقلیتیں ہیں تو اہلِ کتاب کی جن سے اسلام نے معاشرتی روابط حتیٰ کہ ازدواج تک کی اجازت دی ہے- مسلمانوں کیلئے یہ مسئلہ صرف ان ممالک میں رونما ہوتا ہے جہاں ان کی اقلیت ہے- لہٰذا یہاں ان کی یہ خواہش کہ وہ اپنی جداگانہ انفرادیت کو محفوظ رکھیں ہر اعتبار سے حق بجانب ہے-

میری رائے میں اب یہ مسئلہ پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اسلام کی وحدت بدستور قائم ہے- یہ وحدت جیسا کہ میں نے کسی دوسری جگہ بیان کیا ہے اسلام کے دو بنیادی عقائد (توحید اور ختم نبوّت) پر مبنی ہے جن میں پانچ ارکان اسلامی کا اور اضافہ کر لینا چاہئے- اس وحدت کو اگر کسی نے توڑا تو ایران میں بہائیوں اور ہندوستان میں قادیانیوں نے- بہرکیف اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ وحدتِ اسلامی نے عملی اعتبار سے ایک ایسی مشترک روحانی فضا قائم کر دی ہے جس میں تمام دنیائے اسلام شریک ہے- اس سے بلادِ اسلامیہ کا ایک سیاسی مجموعہ تیار ہو سکتا ہے جو ممکن ہے ایک عالمگیر ریاست یا اسلامی ریاستوں کی ایک انجمن کی شکل اختیار کر لے اور جن کے باہمی معاہدات سیاسی اور معاشی مصالح پر مبنی ہوں- یوں پتہ چلتا ہے کہ دینِ اسلامی نے اپنی سیدھی سادھی ہیئت کا جو تصور قائم کیا ہے وہ کس طرح ہر زمانے میں اپنے لئے ایک نیا راستہ تیار کر لیتی ہے- (طلوع اسلام فروری 1936ء سے ماخوذ- مدیر مسئول)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرسیّد احمد خانؒ

کیا نیچر کے ماننے سے خدا معطّل ہو جاتا ہے؟

بہت نیک، مگر کم غور کرنے والے بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر دنیا ایک قانونِ قدرت پر چلتی ہے اور اس کے بر خلاف نہیں ہو سکتا، گو وہ قانونِ قدرت خود خدا ہی نے بنایا ہو، مگر اس کے بنانے کے بعد خدا کے کرنے کے لئے کیا کام باقی ہے۔ پھر ایسے خدا سے جو معزول یا معطّل ہو گیا ہے ہم کو کیا غرض ہے اور وہ ہمارے کس کام کا ہے۔

نعوذُ باللہ، ایسے خیالات تعمق نہ کرنے سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ نعوذ باللہ اگر خدا قانونِ قدرت بنا کر معطّل ہو گیا ہو تو اس قانون قدرت کا قائم رکھنے والا اور دنیا کو اس قانون کے مطابق چلانے والا کون ہو گا؟

وہ لوگ ہمیشہ ان خیالات اور قیاسات کو جو ممکنات سے اخذ کرتے ہیں، ذاتِ باری کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک کاریگر نے گھڑی بنائی جو باقاعدہ چلتی ہے، اب گھڑی بنانے والے کو اس سے کچھ تعلق نہیں رہا۔ وہ جیتا ہو یا مر جائے، معطّل ہو یا معزول، وہ گھڑی بدستور چلا کرے گی۔ اسی قیاس پر کہتے ہیں کہ بالفرض اگر خود خدا ہی نے قانونِ قدرت بنا دیا جس پر دُنیا چلتی ہے تو اب خدا کے لئے کیا کام رہا اور ہم کو اس سے کیا غرض رہی۔

ایک مقدس خدا پرست کہہ سکتا ہے میاں اب وہ ہمارے اور تمہارے لیے بہشت میں محل اور باغ بنا رہا ہے اور دوزخیوں کے لیے جہنم میں آگ سُلگا رہا ہے۔ خیر یہ تو ایک دل لگی کی بات ہے، مگر جو خیال کہ ممکنات سے اخذ کیا ہے اس کو خدا کے ساتھ منسوب کرنا محض غلطی و نادانی ہے۔

علّۃ اور علّۃ العلل میں بہت فرق ہے، علّت مؤثر ہوتی ہے اشیاءِ موجودہ میں بلا واسطہ یا بواسطہ دیگر علل کے اور وہ خود بھی معلول ہوتی ہے کسی علّۃ کی۔ اور علّۃ العلل سبب ہوتی ہے اس شیئی کے وجود کی اور اس لیے وجود اس شیئی کا منحصر ہوتا ہے وجود علّۃ العل پر اور تمام علل و معلول جو ہوتی رہتی ہیں وہ معلول ہوتی ہیں اسی علّۃ العلل کی اور اس لیے علّۃ العلل اپنے معلول بلا واسطہ یا بواسطہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، بلکہ ہر وقت اس کے لیے علّۃ ہوتی ہے اور اگر علیحدہ ہو تو وجود شیئی کا معدوم ہو جائے اور تسلسل علّۃ و معلول کا نہ رہے اور یہی معنی احاطت کے ہیں جہاں خدا نے فرمایا ہے "**اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْئٍ مُّحِیْطٌ**"(41 فصلت آیت 54)۔

اسی مطلب کو خدا نے بہت ہی عمدہ و بے مثال مثال سے سورۂ نور میں بتایا ہے جہاں فرمایا ہے " **اللہ نور السموات و الارض** یہ آیت، آیت نور مشہور ہے اور بڑے بڑے عالموں نے اس کی تفسیر کی ہے اور عجیب عجیب نکات بیان کئے ہیں جو حسب خیال ہمارے محسن کے نعوذ باللہ خدا کو بھی نہ سوجھے

ہوں گے۔ امام غزالی صاحب نے اس آیت کی خاص تفسیر بھی ہے جس کا نام "مشکواۃ الانوار" ہے۔

مگر اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ وجود تمام چیزوں کا ذاتِ باری پر منحصر ہے اور نور کی تمثیل سے اس کو سمجھایا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد جگہ خدا نے اپنے آپ کو خالق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہاں نور سے' نور کیا ہے؟ **مایظھر بہ الاشیاء** یعنی جس کے سبب سے تمام چیزیں معلوم ہوتی ہیں' اگر نور نہ ہو اور ظلمت محض ہو تو تمام چیزیں معلوم نہ ہوں جو بمنزلہ عدم یا نہ ہونے کے ہیں۔ پس جس طرح ظہورِ اشیاء کا نور کے ہونے پر منحصر ہے اسی طرح وجودِ موجودات کا ذاتِ باری پر مع اس کی صفات کے جو اس کی عین ذات ہیں منحصر ہے۔ پس اگر وہ معزول یا معطّل ہو تو تمام عالم معدوم ہو جائے اور ایک آن بھی اس کا وجود نہ رہے۔ پس یہ سمجھنا کہ قانونِ قدرت بنانے سے نعوذ باللہ خدا معطل یا معزول ہو جاتا ہے کس قدر نادانی ہے۔ **ھو الحی القیوم ای ھو المقوم بذاتہ والمقوم لکل ما سواہ فی ماھیتہ و وجودہ** (تفسیر کبیر) یعنی وہ اب قائم ہے اور قائم رکھنے والا ان تمام چیزوں کا ہے جو اس کے سوا ہیں۔ پس خدا کسی وقت بھی بے کار نہیں ہے۔

مقالاتِ سرسیّد سے ماخوذ

آپ کی یہ شکایت

بھی درست کہ رسالہ نہیں پہنچا یا وقت پر نہیں ملا

اور یہ بھی

کہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر ہوئی یا اس میں کوئی فروگذاشت ہوئی

لیکن

کیا آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ آپ نے

1- تبدیلی پتہ کی بروقت اطلاع دی ہے یا نہیں۔
2- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھا ہے یا نہیں۔
3- زرِ شرکت ادا ہو رہا ہے یا نہیں۔
4- اپنے علاقے کے پوسٹ کوڈ کی اطلاع دی ہے یا نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر بشیر الحق- پشاور

اللہ - انسان اور ارض

ایک ایسی ہستی' جس کا تصوّر انسانی ذہن میں کسی بھی شکل میں نہیں آسکتا اور جو اس کائنات کی خالق بھی ہے' سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی عقل و شعور رکھنے والی مخلوق کے ساتھ ایسی زبان میں ہمکلام ہو جسے نہ وہ سمجھے' نہ سمجھ سکے- خاص طور پر جب عقل و شعور بھی اس ہستی کا دیا ہوا ہو- کرہ ارض پر اس وقت ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں- یہ بات ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ خداوند تعالیٰ ان زبانوں میں سے صرف عربی زبان سمجھتا ہو گا اور دوسری کوئی زبان اس کی سمجھ میں نہ آتی ہو گی- ایسی بات ہرگز نہیں- وہ لوگ جو خدا کی ذات سے انکار کرتے ہیں اور اپنے انکار کے ثبوت میں ہزاروں دلائل دیتے ہیں' وہ بھی جب اسے پکارتے ہیں تو اپنی ہی زبان استعمال کرتے ہیں- اس لئے اللہ بھی انسان سے اسی زبان میں بات کرتا ہے جو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے- زبان کو سمجھنے کے لئے انسانوں نے اپنے ہاں ایک ایسا ذریعہ اختیار کر رکھا ہے جس پر سب انسان متفق ہیں- اس ذریعے کو عربی میں لغت اور انگریزی میں ڈکشنری کہتے ہیں- میں نے آج تک کسی انسان کو نہیں دیکھا جس نے کسی بھی لفظ کے معانی لغت یا ڈکشنری میں دیکھے ہوں اور اس کے معانی سے اختلاف کیا ہو- لفظ "اللہ" جسے ہم اپنی اصطلاح میں خدا بھی کہتے ہیں' کو ہی لیجئے- آیئے دیکھتے ہیں عربی لغت میں اس کا مطلب ہے-

لغوی طور پر **اَلِہَ' اِلَیْہِ' یَاْلَہُ** کے معنی ہیں گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا متحیر ہونا- اور **اَلَہَ یَاْلَہُ** کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا- امان میں لینا- اس اعتبار سے اِلٰہٗ کے معنی ہوں گے ایک ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے- جس کی عظمت و بلندی کے تصوّر سے انسان متحیر ہو جائے- بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ **لَاہَ یَلِیْہُ** سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں- بعض کہتے ہیں کہ **اَلَہَ** کے معنی ہیں- وہ person غلام بن گیا اور **اَلَّھَہٗ** کے معنی ہیں اس نے اسے غلام بنا لیا- اس اعتبار سے **اِلٰہٗ** کے معنی ایسی ہستی ہوں گے جس کا غلبہ و اقتدار تسلیم کیا جائے- جس کے قانون کی اطاعت کی جائے- جس کی محکومی اختیار کی جائے- **اِلٰہٗ** وہ جامع لفظ ہے جو اللہ کے ہر قسم کے تصوّر کو محیط ہے- قرآن نے ذاتِ خداوندی کے لئے "اللہ" کا لفظ استعمال کیا ہے- دراصل یہ لفظ ال- اِلٰہ کا مرکب ہے- کثرت استعمال سے اِلٰہ کا ھمزہ (الف) گر گیا اور لام- لام میں مدغم ہو گیا اس طرح ال- اِلٰہ سے "اللہ" بن گیا- اس اعتبار سے اللہ کے معنی ہوں گے- وہ خاص اِلٰہ جس کا تصور قرآن نے پیش کیا-

یوں تو اس دنیا میں ہر شے اس کی مخلوق ہے لیکن سب سے احسن اور خوبصورت مخلوق ہونے کا شرف انسان ہی کو حاصل ہے- جسے اختیار و ارادے

سے نواز کر اس سے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔
انسان کو میں نے سب سے خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

اب لفظ ارض کو لیجئے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔
لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ 2/284
کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی ملکیت اللہ کی ٹھہری۔

یہاں غور کا مقام ہے کہ اللہ مالک اور زمین و آسمان اس کی ملک۔ انسان کا اس میں ذکر ہی نہیں۔ انسان کو اختیار دیا' ارادہ دیا' عظمت دی' اقتدار دیا لیکن سب کچھ عطا کرنے کے باوجود کچھ نہیں دیا تو وہ "حق ملکیت" ہے۔ جو اس نے اپنے پاس رکھا۔ یہی وہ محرومی تھی جو حضرت انسان کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چپکے چپکے اس نے زمین پر لکیر کھینچی اور اس کا مالک بن بیٹھا۔ پھر کیا تھا انسانی خون بہتا رہا۔ لکیریں پھیلتی اور سکڑتی رہیں۔ مفاد پرستوں نے اس کے حق میں وہ وہ دلائل تراشے کہ الامان والحفیظ۔ مجوسیوں نے اس کے لئے تقدیر کا عقیدہ وضع کیا۔ پنڈت نے اسے ورنوں کی تقسیم بتایا۔ ملا نے اللہ کی مرضی کہہ کر' اس کے خلاف صدائے احتجاج کی گنجائش ہی نہ رہنے دی۔ اقبال محوِ حیرت ہے کہ

رنج بے گنج است' تقدیر ایں چنیں
گنج بے رنج است' تقدیر ایں چنیں

یہ کیسی تقدیر ہے کہ ایک کے پاس کسی تکلیف کے بغیر خزانہ اور دوسرے کے پاس خزانے کے بغیر تکلیف۔

اصلِ دیں ایں است اگر اے بے خبر
می شود محتاج از محتاج ترا

اے بے خبر اگر دین کی اصل یہی ہے تو اس سے تو محتاج اور زیادہ محتاج ہوتا چلا جائیگا۔

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا
باز در خواب گراں دارد ترا

ایسے دین پر تو افسوس ہے جو تجھے سلا دے اور اس کے بعد تیری نیند میں اور زیادہ غفلت پیدا ہو جائے۔

باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

الارض للہ۔ زمین اللہ کی ہے کا مطلب واضح ہے جو شخص اس عیاں حقیقت کو نہیں دیکھتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔

حق زمین را جز متاع ما بگفت
این متاع بے بہا مفت است مفت

اللہ نے زمین کو صرف متاع کہا ہے۔
وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ○
یہ متاع بھی تو اس نے مفت دے رکھی ہے۔ جس چیز سے کوئی فائدہ حاصل کیا جائے اسے متاع کہتے ہیں۔ فائدہ اٹھانے سے وہ چیز ملکیت نہیں بن جاتی۔

دہ خدایا نکتہ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را گیر

اے جاگیردار! مجھ سے یہ نکتہ سمجھ لے۔ زمین سے اپنا رزق اور قبر حاصل کر' زمین کو اپنی ملکیت نہ بنا۔

رزقِ خود را از زمین بردن روا است
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است

زمین سے اپنی روزی حاصل کرنا تو ٹھیک ہے۔ لیکن زمین انسان کی صرف متاع ہے۔ ملکیت یہ خدا کی ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔ **لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ**۔
زمین اور آسمانوں میں یعنی کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قند مکرر
محترمہ ثریا عندلیب

حقوق یا فرائض؟

حقوق و فرائض کی بحث بڑی پرانی چلی آرہی ہے کس کے حقوق؟ کس کے فرائض؟ اس کا تصفیہ نہیں ہو پاتا۔ فرائض کی بات تو بہت کم ہوتی ہے۔ نعرے حقوق کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ مرد اپنے حقوق کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں تو عورتیں اپنے حقوق کے لئے فریاد کرتی نظر آتی ہیں۔ والدین اپنے حقوق نہ ملنے پر شکوہ کناں رہتے ہیں تو اولاد اپنے حقوق کی خاطر شعلہ بداماں ہو رہی ہے۔ اسی طرح عزیز و اقارب اپنے حقوق کے لئے جھپٹا جھپٹی کر رہے ہیں تو پڑوسی اپنے حقوق کی حفاظت میں مرنے مارنے پر تلے ہیں۔

غرضیکہ سب طرف سب کو اپنے اپنے حقوق کی فکر کھائے چلی جا رہی ہے۔ فرائض پر کسی کی نظریں نہیں جاتی۔ فرائض کی بجا آوری کے بغیر حقوق برآری ہو تو کیسے؟ فرائض کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کا نتیجہ حقوق سے محروم رہ جانے کے سوا ہو نہیں سکتا۔ حقوق کی جنگ فرائض کے ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔ نعرے بازی سے نہیں۔ کبھی ہم نے اس نکتہ پر غور کیا؟ اگر کرتے تو معاشرے کو حق تلفیوں کے زخموں سے بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق میں تفریق و امتیاز کا بھی چرچا بہت ہوتا ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ انسان بطور انسان حقوق رکھتا ہے اور خالق کائنات نے ہر انسان پر دوسرے انسان کے حقوق لازم ٹھہرائے ہیں۔ اگر ان حقوق کو سمجھ لیا جائے تو انسانی معاشرہ میں نہ کوئی اپنے فرائض سے غافل ہو سکتا ہے نہ کسی کی حق تلفی کر سکتا ہے اور حق تعالیٰ کا عطا کردہ یہ اصول بھی اس کے بندوں کے سامنے رہنا چاہئے کہ اس (اللہ) کے حقوق کی ادائیگی انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ قرآن کریم میں انسانوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔

حقوق اللہ کے تعلق سے پیارے قرآن میں سورہ انعام میں صرف ایک مقام پر یہ کہا گیا ہے کہ **وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ** "اور جب فصل کاٹو تو اس میں سے اس (اللہ) کا حق بھی دے دیا کرو" ظاہر ہے کہ یہ بھی درحقیقت محتاجوں کا ہی حق ہے۔ جسے اس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الذّٰریت اور سورۃ المعارج میں۔ مومنین کی کمائی میں ہر اس شخص کا حق معلوم بتایا گیا ہے جس کے پاس اپنی ضرورت سے کم ہو یا جو بالکل کما سکنے کے قابل نہ ہو' **حق للسائل و المحروم**۔ انسانی حقوق (فرائض پر جب ہم بصیرت کی نگاہ ڈالتے ہیں تو پوری انسانی زندگی فرائض کی بجا آوری اور حقوق کی ادائیگی کی ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ہمہ وقت جاری و ساری رہنے کا متقاضی ہے جہاں اس میں تعطل پیدا ہوا' انسان مقام انسانیت پر کھڑا نہ رہ سکا۔ نوعِ انسانی کی تمدنی زندگی کا تمام تر انحصار اسی امر پر موقوف ہے کہ معاملاتِ زندگی میں انسان کیونکر ایک دوسرے کے معاون و مددگار بنتے اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں مجموعی طور پر انسانوں کے حقوق کا ذکر مختلف مقامات پر معاشرتی تعلقات کے حوالے سے آیا ہے اور وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ افرادِ معاشرہ کی مختلف حیثیتوں میں ان کے لئے حقوق و فرائض کی نوعیت کیا ہے۔ کس کس کے فرائض کس کس کے حقوق بنتے ہیں۔

چونکہ معاشرہ کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی حقوق و فرائض کا سلسلہ بھی گھروں سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے قرآنِ کریم نے میاں۔ بیوی۔ والدین۔ اولاد۔ بہن بھائی اور عزیز و اقارب کے آپس کے حقوق و فرائض کی ادائیگی

کو پہلے درجہ پر رکھا ہے۔ اور جگہ جگہ اس کی تاکید کی ہے اور ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ میاں بیوی کے تعلق سے قرآن کریم نے مرد عورت کے حقوق میں کوئی تخصیص روا نہیں رکھی۔ فرمان ربی ہے۔ **لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** "مردوں کے ذمہ عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے عورتوں کے ذمے مردوں کے حقوق ہوتے ہیں۔ جانے پہچانے طریقہ پر۔"

اس میں معاشی، معاشرتی، سماجی، اخلاقی تمام قسم کے حقوق شامل ہیں۔ اولاد اور والدین کے درمیان حقوق و فرائض کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اولاد کی صلاحیتوں کو نہایت غور و پرداخت سے پروان چڑھانا ان کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا ماں باپ کا فریضہ ہے۔ ان کی جسمانی تربیت بھی اور علمی و اخلاقی تربیت بھی۔ دراصل نسل انسانی کے حقوق کی ابتدا تو اسی دن سے شروع ہو جاتی ہے جب انسانی بچہ اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے اور آغوشِ مادر میں حفاظت و راحت پاتا ہے۔ ایک ماں جو اپنے بچے کو پالتی ہے چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی ہے اور بغیر چون وچرا اپنی جان پر سختیاں اور تکلیفیں برداشت کر کے بچے کے جسم و جان کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔ تو دراصل وہ انسانیت کا سب سے بڑا حق ادا کر کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی بنیاد رکھتی ہے۔ ماں اپنے بچے کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ آگے چل کر ان لوگوں کے حقوق ادا کر سکے۔ جن سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ جب اولاد بالغ و باشعور ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اہل ہو جاتی ہے تو اس کے فرائض والدین کے حقوق بن جاتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں۔ کہ کتابِ مبین قرآنِ حکیم میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کا حکم بار بار آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی 23 ویں آیت میں بتایا گیا ہے کہ پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی ہستی کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار نہ کرو۔ اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔ دوسری جگہ اللہ کا فرمان ہے کہ ہم نے تمہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اس سلسلے کی تمام آیات قرآنی سے اولاد کے والدین کے حسنِ سلوک کی اہمیت واضح ہے۔ والدین کا یہ وہ حق ہے جس سے روگردانی کرنے کا اولاد حق نہیں رکھتی اور یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ حسنِ سلوک سے مراد روپیہ پیسہ سے مدد کر دینا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ بڑھاپے کی وجہ سے جتنی کمی والدین میں آتی جا رہی ہو اس کو اولاد اپنی محنت اور توجہ سے پورا کرتی جائے تاکہ ان کی زندگی متوازن ہونے سے نہ رہ جائے۔ اس کا حسن ختم نہ ہو جائے۔ والدین سے عزت و احترام سے پیش آنا۔ ان سے کسی حالت میں بھی درشت کلامی نہ کرنا۔ ان کی خدمت کرنا یہ سب وہ حقوق ہیں جو حسن و سلوک سے متعلق ہیں اور اولاد کی ذمہ داری ہیں۔ اسی طرح بہن بھائیوں اور رشتے داروں کے معاملے میں عدل و انصاف اور محبت و احسان کو ملحوظ رکھ کر ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے کا ہر فرد معاشرہ کو مکلف ٹھہرایا ہے۔ لیکن حقوق و فرائض کا سلسلہ گھر والوں اور عزیزوں تک ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمارا دین، ہمارا نظام اور ہمارا ضابطۂ حیات قرآنِ کریم گھروں پر توجہ دلانے کے بعد گھروں کی دیواروں کو پیچھے سرکا کر ہمیں پورے معاشرے میں داخل کرتا ہے اور ہمسایوں سے شروع کر کے معاشرے میں تنہا رہ جانے والوں۔ ضرورت مندوں۔ مسکینوں۔ مسافروں سب کے حقوق پورے کرنا۔ اللہ پر ایمان رکھنے والوں کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ ان کے حقوق پورے کرنا اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے قابل بنانا ان لوگوں کے فرائض میں داخل ہے۔ جو مال و دولت اپنی جائز ضروریات سے زیادہ رکھتے ہوں اور عقلِ جہاں بیں سے کام لیتے ہوں۔

یتیموں اور سائلوں کے متعلق قرآن کریم کی ہدایت یہ ہے کہ معاشرے میں بے یارو مددگار اور تنہا رہ جانے والوں کو دباؤ اور دھتکارو نہیں اور نہ ہی کسی ضرورت مند سائل کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرو۔ سائل کے متعلق سورۂ بقرہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ تو اپنے چہروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ منہ سے کچھ مانگتے نہیں۔ وہ لپٹ لپٹ کر مانگنے والے گداگر نہیں ہوتے۔ ایسے پیشہ ور بھیک منگے قرآن پاک کے بتائے ہوئے سائلوں کی شق میں نہیں آتے۔ سائل سے مراد مجبور ضرورت مند ہیں۔ جنہیں خیرات کے طور پر نہیں دیا جاتا بلکہ یہ ان کا حق ہوتا ہے۔ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ ہم داعیانِ دینِ اسلام نے کیا اپنی عملی دنیا میں وہ قرآنی روش اختیار کر رکھی ہے جس میں مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینا لازم ہوتا ہے۔ جو معاشرہ میں لاوارث اور

بے بس رہ جانے والے لوگوں کے لئے اپنی دولت وقف کر دینے کی تاکید کرتی ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جاتا ہے۔ یا ان میں کام کاج کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ یا جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ جب انسان اپنے یہ فرائض پورے کرتے ہیں تو حقوق خود بخود پورے ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق کا خیال رکھنے والے اللہ کے بندوں کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے۔ کہ **يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ** یعنی وہ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں خود تنگی سے ہی گزارا کیوں نہ کرنا پڑے۔"

یہ قرآن کا عطا کردہ وہ اصل الاصول ہے جو انسان کو مقامِ مومن عطا کرتا ہے اور جس سے انسانیت کی نشوونما بلا روک ٹوک ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر کیا ہمارے ہاں ایسا ہو رہا ہے؟ کیا ہم خود بھوکے رہ کر کسی بھوکے کا پیٹ بھرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ہم سے جواب چاہتا ہے۔ اگر ہم سچ بول سکیں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ فرائض سے لاتعلق رہ کر حقوق پر شب خون مارتے رہنا ہمارا مقصودِ حیات بن چکا ہے۔ پھر معاشرہ نفسا نفسی کا شکار کیوں نہ ہو !! بلا شک و شبہ خدا تعالیٰ کی اس سرزمین میں فتنہ و فساد اور ظلم و انتشار اسی وقت پھیلتا ہے جب مرد و زن کے ایک طبقہ کے سر پر مفادِ خویش کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر جتن کرتا ہے اور اسے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے اس طرزِ عمل سے کتنے زیر دست مزید پستے چلے جاتے ہیں۔ خود غرضی اور مفاد پرستی کا یہ انسانیت سوز رویہ دوسرے انسانوں سے ان کے حقوق چھین لیتا ہے۔ اپنے معاشرے میں ہم یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے ہیں۔ مگر اس طرح دیکھتے ہیں گویا کچھ نہیں دیکھا۔ برعکس اس کے ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک قرآنی معاشرہ میں اس مفاد پرست ذہنیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآنِ حکیم ایسی ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افرادِ معاشرہ کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے لئے اپنی کوششوں کے ماحصل کو کھلا رکھے۔ اور یہ جان لے کہ افرادِ معاشرہ اعضائے انسانی کی طرح ہوتے ہیں۔ اور ایک عضو اس وقت تک پوری پوری نشوونما حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ جب تک دیگر اعضاء بھی پوری پوری نشوونما نہ پا رہے ہوں۔ قرآنی اصول و اقدار کی روشنی میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کا تدریجی سفر بالآخر اس منزلِ مقصود تک لے جاتا ہے۔ جہاں ہر شخص دوسرے شخص کا حق بہ طیبِ خاطر ادا کرتا ہے اور یوں معاشرہ تمام افرادِ معاشرہ کی ذمہ داریاں اٹھا لیتا ہے۔ پھر کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں رہتا۔ لیکن اگر ہم نے حقوق کے نعرے لگاتے ہوئے فرائض کو بھلائے رکھا تو انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی حق تلفی کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ نہ ہی مغفرت ملے گی۔ وہ معاشرہ کبھی ترقی و سرفرازی حاصل نہیں کر سکتا جہاں حقوق و فرائض کی تقسیم اس طرح ہو کہ فرائض اور ذمہ داریاں تو ایک طبقہ پر لاد دی جائیں اور حقوق سارے کے سارے دوسرا طبقہ اپنی جھولی میں بھر لے۔ معاشرہ وہی پھل پھول سکتا ہے جہاں حقوق و فرائض شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ جہاں یہ جھگڑا نہیں ہوتا کہ یہ حقوق میرے ہیں اور یہ فرائض تیرے۔ یہ معاشرہ قرآنی معاشرہ ہوتا ہے۔ جہاں ہر شخص اپنے فرائض ادا کرتا ہے اور ہر شخص کو اس کے حقوق ملتے ہیں۔ کیا ہم پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟

سوچئے!

اگر امروز تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصطفیٰ شان- ناروے

رزق کی تقسیم

رزق کی تقسیم کا خدائی نظام سمجھنے کے لئے اپنے ہاں کا عسکری نظام نگاہوں کے سامنے لایئے- فوج میں جب بھی کوئی نئی رجمنٹ وجود میں لانا مقصود ہوتی ہے تو اس حکم کی ایک نقل اس محکمے کو بھی ارسال کر دی جاتی ہے جو راشن سپلائی کرتا ہے- فوج کے ہر سپاہی کے لئے راشن کی قسم اور مقدار پہلے سے متعین ہوتی ہے- نظام کی خوبی یہ ہے کہ جونہی ایک فوجی بھرتی ہو کر یونٹ میں قدم رکھتا ہے اس کے حصے کا رزق وہاں پہلے سے موجود ہوتا ہے- یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ عہدے کا فوجی بھی رات کو بھوکا سویا ہو- یہاں اگر کوئی فوجی بھوکا رہا یا اس کے حصے کا راشن پوری مقدار میں اس تک نہیں پہنچا تو قصور فوج کا نہیں- قصور ان کارکنوں کا ہے جو ان جوانوں تک راشن پہنچانے یا تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں-

انسانوں کی دنیا میں قدم رکھیں تو نظر آتا ہے کہ قدرت کسی انسانی بچے کو اس وقت تک وجود میں نہیں لاتی جب تک اس کی ضرورت کا رزق اس زمین پر فراہم نہ کر دیا گیا ہو اب اگر کوئی ماں اپنی چھاتیوں کا حسن برقرار رکھنے کے لئے یا معاشرہ بددیانتی سے اس کے حصے کا دودھ ہڑپ کر جاتا ہے تو قصور ماں کا ہے یا معاشرے کا نہ کہ نومولود کے نصیب کا-

بات واضح ہو گئی کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہر فرد کے حصے کا رزق اس تک صحیح صحیح مقدار میں پہنچے تو اس کے لئے ایسا نظام وضع کرنا ہو گا کہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے حصے کا رزق ہڑپ نہ کر پائے- اس نظام کا خاکہ خالق کائنات نے اپنی کتاب عظیم میں دیا ہے-تقسیم رزق کے قرآنی نظام کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ذرائع رزق افراد کی نجی تحویل میں اس طرح ہوں کہ کوئی ان پر بند نہ باندھ سکے اور اس حقیقت پر سب کا یکساں ایمان ہو کہ انسانی جسم کے لئے رزق اتنا ہی سود مند ہے جتنا اس جسم کی ضروریات کا کفیل ہے- اپنے حصے سے زیادہ لیا ہوا رزق نہ جسم کے لئے مفید ہے نہ روح کے لئے سود مند- دوسروں کا نوالہ چھیننے کے لئے انسان آزاد ضرور ہے لیکن اس وقت کا خوف اس پر ہر آن طاری رہنا چاہئے کہ خالقِ کائنات صریح الحساب ہے اور اس ایک نوالے کا حساب اسے بہرحال دینا ہو گا-

حیرت اس بات پر ہے کہ ہمارے ہر گھر میں رزق کی تقسیم کا جو نظام رائج ہے' وہ قرآنی تعلیمات کے قریب ہے- یعنی گھر کا ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق کام کرتا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق لیتا ہے- بلکہ ہوتا یوں ہے کہ گھر میں کمانے والا (کفیل) اکثر اپنی ضرورت سے بھی کم لیتا ہے- جب کہا جاتا ہے کہ یہی نظام معاشرے میں رائج کر دیجئے تو جواب ملتا ہے یہ تو کیمونزم ہے- حالانکہ گھر معاشرے ہی کی سمٹی ہوئی شکل کا نام ہے- گھر کی دیواریں گرا دی جائیں تو معاشرہ بن جاتا ہے- سوال یہ ہے کہ جو نظام گھر کے اندر اسلامی ہے وہ معاشرے میں کس طرح کیمونزم بن جاتا ہے-

بھوک حیوان بھی مٹاتا ہے مگر اس طرح کہ جب اس کا اپنا پیٹ بھر جائے تو اسے پرواہ نہیں ہوتی کہ بچا ہوا کھانا کون کھاتا ہے- رزق کی تقسیم کو متوازن بنایا جا سکتا ہے- بھوک مٹ سکتی ہے مگر اس کے لئے ہر فرد کو پابند کرنا ہو گا کہ وہ دوسروں کے حصے کا رزق' دوسروں کے لئے چھوڑ دے- کاش ہم حیوانوں سے ہی سبق سیکھ لیتے-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

حکمرانوں کی شاہ خرچیاں

وٹو صاحب رخصت ہوئے' نئی حکومت بن رہی ہے' نئے وزیر عنان اقتدار سنبھال لیں گے' جب کبھی کوئی نئی وزارت بنتی ہے' مجھے ایک پرانی بات یاد آجاتی ہے--- گواہ ٹھہراتا ہوں اس بات کا جناب محمد حنیف رامے صاحب کو جو اب پنجاب اسمبلی کے سپیکر ہیں اور اس وقت وہ پنجاب کی پہلی پیپلز پارٹی کی حکومت کے وزیر خزانہ تھے' امید ہے وہ بھولے نہ ہوں گے' ان دنوں وہ سندر داس روڈ والے فلیٹ میں راجہ غالب احمد صاحب کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

میرے ساتھ میرے دوست ڈاکٹر صفدر بخاری تھے' ہم نے ان سے کہا کہ ہم دو ایک گزارشات آپ تک پہنچانے آئے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو ہم نے ان سے کہی--- (باقی کی باتیں اب غیر متعلقہ ہیں اس لئے ان کا ذکر نہیں کروں گا۔)

ہم نے ملک کے دو لخت ہونے کا ذکر کیا' کہا ہم پہلے ہی غریب ملک تھے۔ اب زیادہ ہی مجبور ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں تعمیرِ نو کرنی ہے' کمر ہمت کسنی ہو گی' اخراجات کم کرنے ہوں گے' دو وقت کی بجائے ایک وقت کی کھانی پڑے ہم تیار ہیں-- ہم نے تجویز دی کہ ملک میں پہناوے کے لئے ایک ایسا کپڑا تیار کیا جائے جو سب پہن سکیں۔ غریب بھی وہی پہنے' امیر بھی وہی' کلرک بھی' افسر بھی' انسان کپڑے سے نہ پہچانا جائے' اپنے کام سے پہچانا جائے' وردی سب کی ایک ہو' رینک کے نشان مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثال ہم نے چین والوں کی دی' ابھی ماؤزے تنگ اور چو این لائی زندہ تھے۔ ان کا پہناوا' ان کا رہن سہن دیکھ لیں' ہم نے یہاں ان کے وفد آتے دیکھے ہیں۔ وہی نیلی سی پتلون' وہی ماؤ کالر والا کوٹ اور کینوس کے جوتے--- ہمارے ہاں سرکاری رہائش گاہوں میں جب کبھی نئے وزیر آتے ہیں تزئین و آرائش کا اہتمام کیا جاتا ہے' فرنیچر بدلا جاتا ہے' نئے قالین بچھتے ہیں' نئے پردے لٹکائے جاتے ہیں' نئی کراکری آتی ہے' کیا پرانے وزیر یہ چیزیں ساتھ لے جاتے ہیں یا ہر دفعہ نئے آنے والے وزراء پہلے والوں سے اتنے زیادہ بلند ذوق اعلیٰ تر مخلوق ہوتے ہیں کہ پہلے والے پردے' قالین' فرنیچر' کراکری ان کے شایانِ شان نہیں ہوتی--- پھر نئی گاڑیاں بھی آتی ہیں-- کیا پرانی والی گاڑیاں یکسر بیکار ہو چکی ہوتی ہیں-- آپ عوامی جماعت کے لوگ نئی مثال کیوں قائم نہیں کر سکتے۔

انہوں نے ہماری باتیں روایتی صبر و تحمل سے سنیں' اس زمانے میں کچھ فضا میں بے تکلفی بھی تھی وہ بھی عوام میں سے یعنی "ہمارا ساتھ" تھے اس لئے وزارتی ہمدردانہ غور کی فضا قائم نہ ہونے دی۔ سوال و جواب بھی ہوئے' ہلکی پھلکی بحث بھی ہوئی۔

انہوں نے فرمایا اور قائدِ عوام کے حوالے سے کہ قوم پہلے ہی افسردہ ہے' اس قسم کی بندشوں

سے مایوسی بڑھ سکتی ہے' مورال پہ اثر ہو سکتا ہے' قوم احساسِ کمتری کا شکار ہو سکتی ہے۔ ہم نے کہا کہ چینیوں کو تو ہم نے کبھی جھینپتے ہوئے' اپنی ہیئت کذائی پر شرمندہ ہوتے نہیں دیکھا' وہ تو روس اور امریکہ والوں سے اسی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنا کرتے ہیں۔

ملاقات ختم ہوئی بات آئی گئی ہو گئی' اس کے بعد جو کچھ ہوا ساری قوم اس کی گواہ ہے۔

قوم نے تو یہ بھی دیکھا کہ جنہوں نے یہ دعوے کئے کہ وہ حجروں (خواتین والے حجرے نہیں مساجد کے حجرے) میں بیٹھ کر انصاف کریں گے ایئرکنڈیشنڈ مرسڈیز مہیا کرنے پر اصرار کرتے رہے۔

جب بھی حکومت بدلتی ہے' نئی وزارت بنتی ہے' نئے وزیر آتے ہیں یہی داستان دہرائی جاتی ہے۔

اب جو لوگ پرانے وزیراعلیٰ کی شاہ خرچیوں کی تفاصیل سنا رہے ہیں کل کو جب وہ ان محلوں میں بسیں گے یہی قصہ دہرایا جائے گا' نئے پردے' نئے قالین' نیا فرنیچر' نئی کراکری' نئی گاڑیاں------

اور پھر جب یہ رختِ سفر باندھیں گے---

یہی الزامات سننے میں آئیں گے-- اللہ نہ کرے۔

اُس زمانے میں تو اپنی کچھ رسائی تھی' اب تو غریب شہری کی بات ایوان ہائے شاہی تک پہنچتی ہی کب ہے' دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے---

اب تو سب پڑھے لکھے' دانشور' صحافی سبھی پہ شو- دکھاوے اور امارت کا بھوت سوار ہے' رسالے' اخبار' ملبوسات کی رنگینی' بوتیکوں کی نیرنگی کے بل پر دامانِ باغباں و کفِ گل فروش کا نقشہ پیش کرتے ہیں' ماڈلنگ' فیشن شوز کے بھیس میں اجسام کے دل آویز خطوط اور زلف و گیسو کے پیچ و خم کی نمائش اور تشہیر کے لئے وقف ہو چکے ہیں_اخبارات اور رسائل ہی نہیں' ٹی وی سمیت سارے ذرائع ابلاغ اسی چکر میں ہیں۔ بہانہ ڈش کا اور نیتیں اپنی خراب۔ دراصل اپنی تو کوئی اقدار رہی نہیں' موسیقی ہے تو نری نقالی' ڈرامے ہیں تو اس شان و شوکت کے پس منظر کے ساتھ' ایسے ایسے ایوان' ایسے ایسے ڈرائنگ روم اور لوازمات کہ عقل دنگ رہ جائے۔ بجا کہ یہ پاکستان ہی کی فضا ہے مگر کتنے فیصد کی نمائندہ۔ اس چکر میں Have-Nots محروم طبقوں میں جو اُلجھن' ناآسودگی' بے چینی' بے اطمینانی اندر ہی اندر بڑھتی جا رہی ہے۔ لاوا مختلف صورتوں میں پھٹ رہا ہے' یہ چوریاں' یہ ڈاکے' یہ جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار' اخلاقی قدروں کی پامالی ایک طرف معاشرے کو کس تنزل اور دوسری طرف کس تصادم کی طرف لے جا رہی ہے یہ سوچنا' یہ ذمہ داری کسی کی تو ہونی چاہئے۔ یہ سب یونہی رہا تو اس کا انجام کیا ہو گا' یہ جاننے کے لئے کسی بقراط کی عقل کی ضرورت نہیں ایسے میں کسی کو سادگی کی تلقین کرنا پاگل پن ہی کہا جائے گا۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ 28 ستمبر 95ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

نام کتاب :- Phenomena of Nature and The Quran

مصنف :- ڈاکٹر سید عبدالودود

ایڈیشن :- دوم- صفحات 302

پبلشرز :- خالد پبلشرز

قیمت :- 345 روپے

ملنے کا پتہ :- طلوع اسلام ٹرسٹ
25 بی گلبرگ 2 لاہور

الحمد للہ کہ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی کتاب Phenomena of nature and The Quran جو برسوں سے نایاب تھی اور جس کی بہت مانگ تھی' کا دوسرا edition چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے- اس کتاب کا پہلا ایڈیشن نومبر 1971ء میں شائع ہوا تھا اور درجنوں کے حساب سے اس پر انگریزی زبان میں تبصرے موصول ہوئے تھے- جن میں

Prof. Phillips Hitti of Princeton University

جیسے شہرہ آفاق Orientalist کا تبصرہ بھی شامل تھا-

اردو زبان میں ایک تبصرہ ماہنامہ حکایت نے شائع کیا تھا اور دوسرا محترم پرویز مرحوم کی طرف سے فروری 1972ء کے ماہنامہ طلوع اسلام میں آیا تھا جس کا عنوان تھا "قرآنی کو بکن کی جوئے شیر" بقول پرویزؒ صاحب "جوئے شیر" سے جہاں کتاب کا حسن نکھر کر سامنے آجاتا ہے- "قرآنی کو بکن" سے صاحب کتاب کا برجستہ تعارف ہو جاتا ہے- چونکہ محترم پرویز صاحب سے بہتر تحریر ہمارے بس کی بات نہیں- اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تبصرہ من و عن شائع کر دیا جائے جو کہ مندرجہ ذیل ہے-

"میں نے' کراچی سے لاہور منتقل ہونے کے بعد' 1958ء میں درس قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا- شرکائے محفل دیکھتے تھے کہ درس میں ایک صاحب نہایت التزام سے' وقت کی پابندی کے ساتھ' بلاناغہ شریک ہوتے ہیں- کشیدہ قامت' کشادہ جبیں' عقابی آنکھ' رعنائی پیکر' چال جیسے کڑی کمان کا تیر' قدموں کے توازن میں سپاہیانہ انداز- تنو مند و توانا- اگر سر کے بالوں کی سفیدی غماز نہ ہو تو کوئی ان کی عمر کا صحیح صحیح اندازہ نہ کر سکے- چہرہ بشرہ تمکنت و جلال کا آئینہ دار- گفتار و اطوار نجابت و شرافت کے مظہر- وہ ٹھیک وقت پر آتے اور نپے تلے قدم اٹھاتے سیدھے اپنی مخصوص نشست تک جا پہنچتے- وہ نشست مخصوص صرف ان معانی میں تھی کہ ان کی کرسی کے سامنے ایک ڈسک رکھا ہوتا- وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے- قرآن کریم کا نسخہ اور کاغذوں کا پیڈ ڈسک پر رکھتے- چشمہ صاف کر کے ناک پر ٹکاتے' اور پھر کامل ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ کیفیت کہ کان انتہائی جذب و انہماک سے درس کے الفاظ پر اور ہاتھ لکھنے میں مصروف- درس ختم ہونے پر احباب سے نہایت خندہ پیشانی اور تبسم شیریں سے ملتے- مصافحہ کرتے تو ان کے ہاتھ کی گرفت اور حرارت'

ان کے قلبی تپاک اور خلوص محبت کی گرمجوشی کی مقیاس بن جاتی۔ کامل دس برس تک ان کا یہی معمول رہا۔ باقی اوقات میں وہ اپنے کام سے کام رکھتے۔ معاشرہ کے عام ہنگاموں سے دُور، شور و شغب سے مجتنب، کم آمیز اور رسوم و تقاریب سے بالعموم گریزاں۔ لیکن جب درس کا سلسلہ نصف القرآن تک پہنچا تو انہوں نے نہایت ذوق و شوق سے اس کا جشن منانے کا اہتمام کیا اور دس سال کے بعد جب (1968ء میں) درس کا پہلا دور اختتام پذیر ہوا تو انہوں نے جس جوش و خروش اور خلوص و محبت سے اس تقریب کا اہتمام کیا وہ قرآنِ کریم کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی کا حسین پرتو تھا۔

اس کے بعد جب درس کے دورِ نَو کا آغاز ہوا تو ان کی وہ مخصوص نشست خالی رہنے لگی اور پھر اٹھا ہی دی گئی، چار برس تک وہ اس محفل سے غائب رہے۔ لیکن ان کا یہ غیوب، درحقیقت سورج کا غروب تھا جو دوسری صبح تازہ درخشندگی کے ساتھ وجہِ تابانیٔ عالم ہوتا ہے۔ وہ چار برس کے بعد ایک نہایت مجلّا کتاب ہاتھ میں لئے نمودار ہوئے جس کا نام ہے:

PHENOMENA OF NATURE
AND THE QURAN

یہ آفتابِ تازہ، ڈاکٹر سید عبدالودود کے نام سے متعارف ہے۔ دنیا انہیں ایک ماہر سرجن کی حیثیت سے جانتی تھی اور بہت کم نگاہیں ان کے اس جوہرِ مضمر سے شناسا تھیں۔

قرآنی تعلیم کا مرکزی نقطہ تو انسانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا طریق سکھاتا ہے۔ اسے، اس کی اصطلاح میں، ہدایت کہا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قرآنِ کریم میں کارگہِ کائنات اور خود انسانی زندگی کے متعلق اس قدر متنوّع حقائق بیان کئے گئے ہیں کہ علمِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے دائرے سے باہر ہو۔ یہ وجہ ہے جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کی مکمل تفسیر لکھنا کبھی ایک فرد کے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ ایک فرد کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ وہ ان تمام علوم پر حاوی ہو۔ قرآنِ مجید کی تشریح و تبیّن کا طریق یہ ہے کہ مختلف علوم و فنون کے متخصصین (Specialists) اپنے اپنے علم و فن کی روشنی میں قرآن پر غور و فکر کریں اور متعلقہ مقامات کی تحقیق و تشریح کرتے جائیں۔ اس کے بعد، قرآن کی مرکزی تعلیم کے ماہرین کی جماعت، ان تحقیقات میں ربط پیدا کر کے، ایک جامع انسائیکلو پیڈیا کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ ہو گی قرآن کریم کی صحیح تفسیر۔ واضح رہے کہ یہ تفسیر بھی اس باب میں حرف آخر نہیں ہو گی۔ جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا، اس تفسیر پر مزید غور و تدبّر ہوتا رہیگا۔

ڈاکٹر عبدالودود صاحب بنیادی طور پر سائنس کے سٹوڈنٹ ہیں۔ لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کا خصوصی تعلق علم الابدان سے ہے۔ انہوں نے دس سال تک جو نہایت گہری نظر سے قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا تو اس میں انہیں تخلیق کائنات سے لیکر زندگی کی انسانی سطح تک، ایسے عظیم حقائق نظر آئے جن میں سے ایک ایک کا عالم یہ تھا کہ--- کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست--- چنانچہ ایک طرف انہوں نے قرآنی آیات پر غور و تدبّر شروع کیا، اور دوسری طرف علومِ سائنس کے متعلق اپنے

مطالعہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے اور متقدّمین سے لیکر متاخّرین تک کے سائنسدانوں کی شہرۂ آفاق اور قابلِ اعتماد تصانیف کو کھنگال ڈالا۔ ان میں جو نظریات' حقیقت (Reality) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں' انہیں قرآنی حقائق کی روشنی میں پرکھا۔ اور اس طرح' دس سال کے پہلے قرآنی مطالعہ اور چار سال کی بعد کی کوہکنی اور خارہ شگافی کے بعد اس جوئے شیر کے نکالنے میں کامیاب ہو گئے جو اس وقت ہمارے زیر تبصرہ ہے۔

قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ **لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ** (56/80)۔ اس کی تعلیم و ہدایت سے وہی لوگ صحیح طور پر متمسک ہو سکتے ہیں جو اپنے ذہن کو غیر قرآنی عقائد و تصوّرات سے پاک اور صاف کر کے اس کی طرف آئیں۔ اور ان کی سیرت پاکیزہ اور نگاہ پاک بیں ہو۔ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے ڈاکٹر صاحب محترم کو ان خصوصیاتِ کبریٰ سے بھی بہرۂ وافر نصیب ہوا ہے۔ قلب و دماغ ہر قسم کے غیر قرآنی معتقدات سے منزہ' اور سیرت سفیدۂ سحر کی طرح بے داغ۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان کی کتاب' کو' سائنس کی عام کتابوں کی طرح حار و یابس ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس میں آپ مصنف کے اسلام کے ساتھ شیفتگی اور قرآن کے ساتھ وابستگی کے لطیف جذبات بھی محسوس کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی ژرف نگہی اور دیدہ ریزی کا صحیح اندازہ تو کتاب کے مطالعہ ہی سے لگ سکتا ہے۔ لیکن اس کی ایک خفیف سی جھلک' اس کے ابواب کے عنوانات سے سامنے آسکتی ہے۔

(1) قرآن اور تخلیق کائنات ---- عالم امر و خلق و تقدیر

(2) کائنات پر طائرانہ نگاہ--- نظام فلکی۔ اجرام سماوی۔ بزم انجم۔ شہاب ثاقب۔ شعلہ ہائے مستعجل۔ قرآنی آیات کے آئینے میں۔

(3) سماء الدنیا کی کارفرمائیاں اور تجلیات ریزیاں۔ سقف محفوظ۔ میزان۔ کُنّس و خُنّس۔

(4) کائنات کی طبیعیاتی اور کیمیاوی اساسات' مقسّمٰت امر و مدبّرات امر۔ ملائکہ۔

(5) کرۂ ارض کا کیمیاوی ارتقاء۔ **سللۃ من طین** کی تحیر انگیز وادیاں۔

(6) کرۂ ارض پر زندگی کی نمود۔ نظام ربوبیت کی ناپیدا کنار پہنائیاں۔

(7) اوّلین جرثومۂ حیات-- جہانِ رنگ و بو میں حرکت و نمو کی برکات۔

(8) حیاتیاتی نظام۔ زندگی کی مختلف سطحیں۔ کاروانِ حیات کی متنوّع منازل۔ پچاس پچاس ہزار سال کا ایک ایک دن۔

(9) ماحول اور سامان نشوونما کے کرشمے۔ **یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی** کا مفہوم۔

(10) افزائشِ خویش کا حیرت فروش عمل۔

(11) نفسِ واحدہ سے تخلیق کا مفہوم۔

(12) مزید منازل۔ **علقۃ۔ مضغۃ**

(13) جنسی تفریق۔ **متشابھا و غیر متشابہ** کے معنی۔

(14) قرآن اور نظریہ ارتقاء۔

(15) کرۂ ارض کے ارتقائی منازل۔ **یومین۔ اربعۃ ایام۔ ستۃ ایام۔**

تخلیق انسانی۔ **خلقًا اٰخر**۔ روح کا مفہوم۔ **علمہ البیان** کی عظیم حقیقت۔

(16) انسان اور نظام کائنات- مومن اور متقی کا فرق-

(17) مستقل اقدار حیات- قوانین فطرت اور قوانین قرآنی ____ سرچشمہ علم-

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زِنُورِ مصطفیٰؐ اور ابہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

یہ ہے ایک خفیف سی جھلک اس مایہ ناز تصنیف کے مشمولات کی- میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش جہاں ایک قرآنی طالب علم کے لئے بصیرت افروز ثابت ہو گی وہاں سائنس کے سٹوڈنٹس کے لئے بھی بیش بہا معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ قرار پائیگی- اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اسلاف میں سے بعض حکماء نے قرآنی حقائق پر سائنس کی روشنی میں غور و فکر کیا ہے' لیکن ایک تو اس زمانے میں سائنسی معلومات نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی جس قدر یہ ترقی' برق رفتاری سے ہمارے دور میں ہوئی ہے اور ہو رہی ہے-اور دوسرے ان کا دائرہ فکر بھی محدود تھا- خود ہمارے زمانے میں بھی' اس سمت میں بعض کوششیں ہوئی ہیں- لیکن جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے' ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف زیادہ جامع اور اس لحاظ سے منفرد ہے' اور اس کے بعد قرآنی تحقیقات کرنے والوں کے سامنے ایک نئی شاہراہ کھولتی ہے- خدا کرے کہ دیگر اہلِ علم و فکر حضرات اس باب میں مزید سعی و کاوش کریں تاکہ (قرآنی الفاظ میں) انفس و آفاق میں مضمر آیاتِ خداوندی' مشہود ہو کر دنیا کے سامنے آجائیں- **حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ**-

تاآنکہ یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے' وہ حق ہے (ڈاکٹر صاحب نے اس آیتہ جلیلہ کو لوحِ کتاب کی حیثیت سے درج کیا ہے)-

کتاب نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی فکری کاوشوں کی مظہر ہے بلکہ (صوری حیثیت سے) ان کے حسنِ ذوق کی بھی آئینہ دار ہے- عمدہ سفید کاغذ پر' موتیوں کی طرح ترشے ہوئے ٹائپ میں مطبوعہ- بیشمار بلاکس (جن میں سے بیشتر خود ڈاکٹر صاحب کے اپنے مرتب و منقش کردہ ہیں) خوبصورت ٹائپ میں- صدہا آیات قرآنی وجہِ تزئینِ اوراق- قرآنی آیات کی گلاسری (لغت)_ دیدہ زیب مضبوط جلد- یقیناً یہ بہ صرف کثیر تیار ہوئی ہو گی-

آخر میں' ایک حقیقت کا جھکی ہوئی نگاہوں سے اظہار و اعتراف بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس قابل فخر تصنیف کو اس ہیچ میرز کے نام ان الفاظ میں منسوب کیا ہے-

"میرے فاضل اور قابل استاد' علامہ غلام احمد پرویزؒ کے نام' جن کی بصیرت افروز اور سحر انگیز قرآنی فکر نے' میرے دل میں' پیغامِ خداوندی پر غور و تدبر کے جذبہ اور ولولہ کو بیدار کیا-"

اس کے متعلق میں' اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ یہ' میرے اس حبیبِ مکرّم کی وسعتِ قلب اور کشادگیٔ نگاہ کا آئینہ ہے وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم- البتہ ایک بات ضرور ہے- میں قریب قریب اپنی ہر تصنیف کے آخر میں لکھا کرتا ہوں کہ میری اس کاوش سے اگر ایک قلب سلیم بھی چشمہ قرآنی کے قریب آجائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزی کا صلہ مل گیا- اور میری یہ دعا تو میرے

احباب نے اکثر میری زبان سے سنی ہو گی کہ

عمر بھر کی نواگری کا صلہ
یاخدا ! کوئی ہم نوا ہی دے

میں سمجھتا ہوں کہ اس مستجاب الدّعوات کی بارگاہِ عالیہ نے میری اس دعا کو شرف باریابی عطا فرما دیا جو مجھے ڈاکٹر صاحب جیسا "ہم نوا" عطا کر دیا- وہ میرے ہمنوا ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں وہ مجھ سے بھی آگے نکل گئے ہیں کہ امورِ سائنس کے متعلق میرا مطالعہ عمومی ہے' اور ان کی تحقیقات خصوصی ہیں-

طلوع اسلام کی ایک کنونشن میں' ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے' ڈاکٹر صاحب نے' اپنے صدارتی ارشادات کے آخر میں کہا تھا کہ

دعا میں ہمیشہ انسان کی "خود غرضی" پوشیدہ ہوتی ہے- میری دعا یہ ہے کہ-

جب تک میں زندہ رہوں کم از کم اس وقت تک پرویزؒ صاحب ضرور زندہ رہیں-

اور میری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے بھی زیادہ عمر عطا فرمائے کہ وہ میری فکر قرآنی کے چراغ کو میرے بعد بھی روشن رکھیں- یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است-"

(پرویزؒ)

--- : ---

کتاب کے نئے ایڈیشن کے مندرجات میں کچھ معمولی تبدیلیاں اور اضافے بھی شامل ہیں- باب 2 میں End of The Universe کے عنوان کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ ڈاکٹر صاحب کی ایک دوسری کتاب The Heavens The Earth and The Quran میں تفصیل کے ساتھ درج ہے- باب 5 میں Chemical Evolution یعنی "**سلالة من طين**' کی کہانی قرآن کی زبانی" میں چند تبدیلیاں کی گئی ہیں- باب 9 میں قرآنی لفظ "مؤدت" کو ایک نئے مضمون کے تحت واضح کیا گیا ہے- باب 12 میں Viable age of Fetus یعنی قرار حمل سے کم از کم کتنی مدت (مہینوں یا ہفتوں) بعد انسانی بچہ پیدا ہو تو وہ زندہ رہ سکتا ہے؟ کا نیا مضمون شامل کیا گیا ہے-

یہ درحقیقت محترم مودودی مرحوم کی ایک تحریر پر تبصرہ ہے جو کہ دلچسپ ہے اور کئی سال پیشتر محترم پرویز صاحب کی زندگی میں ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی شائع ہو چکا ہے-

--- : ---

نام کتاب :- دھوکہ نہ کھایئے
مصنف :- حکیم محمد مسیح الدین صدیقی
ناشر :- ادارہ "حق و باطل" ناگپور' انڈیا
ملنے کا پتہ :- ادارہ حق و باطل
GF/128 صادق آباد' مانکا پور
ناگپور 39' مہاراشٹر' انڈیا

قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ **اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ** -- "تمہارے رب کی طرف سے تم پر جو کتاب نازل کی گئی ہے' اسی کی اتّباع کرو' اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو" (7/3)

اس مختصر سی 39 صفحات کی کتاب کا نقطۂ ماسکہ یہی آیتِ کریمہ ہے- اس میں نہایت تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے

مقصود و مراد کیا ہے؟ رسول اکرمؐ اللہ کے نبیؐ ہیں اور اللہ کی کتاب ہی لائے ہیں۔ آپؐ کی سنت یہی تھی کہ قرآن پاک پر خود بھی عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی امر کی تلقین کرتے۔ حضورؐ بخاری و مسلم یا صحاح ستہ نہیں لائے تھے۔

اس کتابچے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی، نکبت و زبوں حالی کے اسباب کیا ہیں، اور اس ذلت سے چھٹکارا پانا کس طرح ممکن ہے۔

ہمارے مذہبی علماء کی حقیقت کیا ہے اور وہ کس چیز کی تبلیغ کو جہاد سمجھ کر سرانجام دے رہے ہیں۔

مصنف نے ایسے ان سوالات کا جواب، جو سنجیدہ ذہنوں میں اکثر ابھرتے ہیں، قرآن کریم کی روشنی میں دیا ہے کہ یہی ان کے نزدیک حق و باطل کی کسوٹی اور معیار ہے۔

اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے ان کے نزدیک ضروری ہے کہ تنگ نظری، مفاد پرستی، ہٹ دھرمی، غلامانہ ذہنیت اور روائتی، سلفی اور تقلیدی طریقوں کو چھوڑ کر زندگی کے تمام گوشوں کے لئے رہنمائی براہ راست قرآن کریم سے حاصل کی جائے۔ یہ اس لئے کہ ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (5/44)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکامات (قرآنِ حکیم) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں"۔

کتابچے کی قیمت Rs. 5/- علاوہ پوسٹل خرچ ہے۔

(احمد حسین قیصرانی)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لئے خوشخبری

آسان قرآنِ مجید

(سلیس لفظی ترجمہ معہ مختصر تفسیر القرآن بالقرآن)

از : علی احمد خان دانشمند جالندھری علیگ

سائز 29 x 8/22، صفحات = 736، ہدیہ = 200 روپے

ملنے کا پتہ :-

دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

کتاب کی افادیت مترجم کے درج ذیل جملوں سے لگائی جا سکتی ہے۔

1- الفاتحہ (کھولنے والی) یعنی انسان کیلئے کامیابی و کامرانی کی راہ کھولنے والی۔ صفحہ 2

2- دیگر کتب مقدسہ کا نور قرآن حکیم کے نور سے ملتا نظر آئے تو اسے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھو اور جو نور کے خلاف ظلمت نظر آئے تو اسے دین کے دشمن کا کتاب مقدس میں داخل کیا ہوا باطل سمجھو کیونکہ جو قرآن حکیم کے خلاف بات ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ صفحہ 3

3- حضرت اسماعیلؑ کا زندہ رہ کر قربان ہونا عظمت والی قربانی تھی، یہی عظمت والا فدیہ تھا۔ صفحہ 552

4- سورۃ عبس کا غلط ترجمہ کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن اندھے کے لئے تیوری چڑھائی نہ پیٹھ پھیری، یہ تمام حرکات تو روحانی اندھے کافر کی ہیں۔ صفحہ 726

5- مسلم قوم نے اگر شب قدر دیکھنی ہے تو قرآن حکیم کے سورج کو دنیا پر طلوع کرے۔ صفحہ 730

(محمد علی فارق)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

1- لو وہ بھی کہتے ہیں

'حدیث و سنت کی تحقیق کا فراہی منہاج' کے عنوان کے تحت ماہنامہ اشراق نے اپنی ستمبر 95ء کی اشاعت میں اپنے امام حمید الدین فراہیؒ کا حدیث کے بارے میں نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے' تفاسیر فراہی سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو قارئین طلوع اسلام کے لئے حیرت اور دلچسپی کا باعث ہو گا۔ لکھتے ہیں۔

"یہ ہمارے بعض بھائیوں کا غلو ہے کہ وہ حفاظت قرآن کی طرح حفاظت حدیث کے قائل ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ بخاری اور مسلم میں جو کچھ روایت ہو گیا ہے' اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف منسوب متعدد روایتوں میں نہایت بھونڈا اختلاف نقل ہوا ہے"۔

"بعض روایات ایسی بھی نقل ہو گئی ہیں' جو قرآن مجید کی اصل کو ڈھانے والی ہیں۔ ایسی روایات کو قبول کرنا' خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کو اس کی اصل سے پھیر دیں گے' لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس کی خاطر' بسا اوقات' وہ صرف آیت کی غلط تاویل ہی پر بس نہیں کرتے' بلکہ اس کے نظام کی قطع و برید بھی کر ڈالتے ہیں' حالانکہ' جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہوتی ہے' نہ کہ اصل"۔

"بعض لوگ ایسی روایات تک قبول کر لیتے ہیں' جو نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہیں' مثلاً: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ بولنے کی روایات یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت"۔

(تفاسیر فراہی' ص 39)

مضمون کو سمیٹتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

روایت کو ردّ یا قبول کرنے میں مولانا فراہی کے پیش نظر جو اصول ہوتے' وہ حسب ذیل ہیں:

1- اصل اساس کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔

2- سنت ثابتہ' منصب رسالت کا ایک قدرتی جزو اور شریعت کی ایک مستقل بنیاد ہے۔ قرآن اور سنت میں تفریق کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔

3- حدیث کی حیثیت ایک فرع کی ہے' جس کا باعث اس کی روایت میں ظن کا دخل ہے۔

4- ان روایات کو قبول کرنا جائز نہیں' جو اصل کے خلاف اور نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہوں۔

5- قرآن کی تصدیق و تائید کرنے والی تمام روایات قابل قبول ہیں۔
6- قرآن اور حدیث کے درمیان اختلاف کی صورت میں حکم قرآن ہو گا۔
7- خبر' اگرچہ متواتر ہو' قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ ظن کی بنیاد پر نسخ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا' کرنے کا اصل کام قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ہے۔

طلوع اسلام : یہی بات طلوع اسلام کہے تو منکر سنت' منکر حدیث اور نہ جانے کیا کیا۔

2- امامت کا جھگڑا

روزنامہ پاکستان- 18 ستمبر 95ء کی ایک خبر ملاحظہ فرمائے۔

پیپی سے 4 کلو میٹر دور موضع ڈاگئی قدیم میں مسجد کے پیش امام کی تقرری پر مسلح تصادم میں دو افراد ہلاک اور ایک شدید زخمی ہو گیا۔ تفصیلات کے مطابق فریقین کے درمیان ایک مسجد کے پیش امام کی تقرری کا تنازعہ تقریباً ایک سال سے چل رہا تھا۔ گذشتہ روز حاجی زرگل نے مولانا نور اکبر سے کہا کہ ہم مسجد اعوان میں اپنے مسلک کے پیش امام کی تقرری کریں گے جبکہ فریق اول نور اکبر نے کہا کہ ہم اپنے مسلک کا پیش امام مقرر کریں گے۔ فریقین کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ دوسرے دن نماز فجر کے درمیان فریقین کے درمیان پھر پیش امام کی تقرری پر تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور نوبت مسجد ہی میں فائرنگ تک آپہنچی۔ فائرنگ سے فریق اول مولانا نور اکبر کا نواسہ ذاکر علی اور حاجی زرگل موقع پر ہلاک ہوئے جبکہ غنچہ گل شدید زخمی ہوا۔ فریقین نے ایک دوسرے کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ اطلاع ملتے ہی پولیس تھانہ پیپی کے ایس ایچ او انسپکٹر روئیداد حسین شاہ ہمراہ بھاری جمیعت جائے وقوعہ پر پہنچے اور لاشوں کو اپنی تحویل میں لے کر پوسٹ مارٹم کے بعد ورثہ کے حوالہ کر دیں جبکہ زخمی کو علاج معالجہ کیلئے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

طلوع اسلام :- مذہب کی بات ہے۔ مذہب میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

3 استفسارات

کراچی سے ایک صاحب نے معلوم کیا ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ لقمان کی آیت 34 میں واضح اعلان کے بعد کہ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے' یہ کس طرح ممکن ہوا کہ آج کل الٹرا ساؤنڈ کی مدد سے معلوم کیا جانے لگا ہے کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ ہم اس کا جواب لکھ ہی رہے تھے کہ ماہنامہ حق و باطل میں حکیم مسیح الدین صدیقی صاحب کا جواب نظر آیا جو مدلل ہونے کے علاوہ خاصا حکیمانہ جواب ہے۔ ذیل میں ہم حکیم صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ انہی کا جواب نقل کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

جواب

آئت کریمہ **ویعلم ما فی الارحام** کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اس کے روائتی تراجم بالکل غلط ہیں۔

جس میں یہ باور کروایا جاتا ہے کہ اس آیت میں موجود پانچوں باتوں کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہے۔ پہلے آپ اس آیت پاک کا صحیح قرآنی مفہوم ملاحظہ فرمالیں:

"فیصلے کی گھڑی (قیامت) کا علم اللہ ہی کو ہے' اپنے اسی علم کی بناء پر وہ جہاں چاہتا ہے پانی برساتا ہے رحموں میں جو کچھ ہے اسے بھی جانتا ہے۔ جبکہ تم میں سے کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے اور نہ یہ کہ کس جگہ اسے موت آئیگی۔ یقیناً یہ سب کچھ از ابتدا تا انتہاء اللہ ہی جانتا ہے کیونکہ وہ ہر بات سے پوری طرح باخبر ہے۔" (لقمان: 34)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس آیت میں فیصلے کی گھڑی کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح تمہیں آئندہ حالات و واقعات اور موت کی جگہ کا علم نہیں ہے۔ اسی طرح تم فیصلے کی گھڑی کے بارے میں بھی نہیں جانتے کہ وہ کب آن پہنچے گی۔

ما فی الارحام کے بارے میں یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ اسے انسان نہیں جان سکتا۔ اور نہ ہی یہ بتایا جا رہا ہے کہ بارش ہونے کا علم بھی انسان کو نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ رب العزت نے ہی انسانوں کو اس کا علم عطا فرمایا ہے کہ وہ بارش ہونے کا مختلف طریقوں سے اندازہ لگا لیں بلکہ ضرورتاً مصنوعی بارش بھی برسا سکیں۔ اور یہ بھی جان لیں کہ رحم مادر میں کچھ ہے یا نہیں' اور ہے تو کیا ہے' لڑکا یا لڑکی؟

الٹرا سونک ٹسٹوں سے تو یہ اب معلوم کیا جانے لگا ہے' ورنہ قدرت نے تو ہزاروں سال پہلے ہی ایسی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں کہ جن سے مشینز کے بغیر ہی پورے اعتماد و یقین کیساتھ یہ معلوم کر لیا جا سکا ہے اور سابقہ میں بھی حکماء اسے معلوم کرتے رہے ہیں کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟

مثلاً ایک نبات یعنی بوٹی ہوتی ہے جسے "چھوئی موئی" یا "شرمیلی" کہتے ہیں۔ طبی زبان میں اس کا نام "لاجونتی" ہے۔ عربی میں اسے "شجرۃ الحیاء" کہا جاتا ہے۔ یہ اس قدر نازک' شرمیلی' حیا دار و حساس ہوتی ہے کہ مردوں کے چھونے سے' بلکہ ان کی قربت' آہٹ و سائے سے بھی سمٹ اور سکڑ جاتی ہے۔ جبکہ عورتیں اسے ہاتھ لگائے تو بھی نہیں سکڑتی۔ آپ حاملہ کو اس بوٹی کے پاس سے گزاریں یا اسے چھونے کیلئے کہیں۔ اگر حاملہ کے ہاتھ لگانے سے اس کے پتے سکڑ جائیں تو سو فیصدی یقین کیساتھ آپ کہہ سکتے ہیں کہ رحم مادر میں لڑکا ہے۔ یہ ہرگز غلط نہیں ہو گا۔ لیکن اگر پتے نہ سکڑیں' تروتازہ ہی رہیں تو آپ پوری گارنٹی کیساتھ کہدیں کہ لڑکی ہو گی۔ اور لازماً لڑکی ہی ہو گی۔ آپ کی بات کبھی غلط ثابت نہ ہو گی۔ یہ سو فیصدی' یقینی' حکیمہ اور بے خطا قدرتی شناخت ہے۔ آپ بھی کبھی تجربہ کر کے قدرت الٰہی کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے علاوہ بھی لڑکا یا لڑکی معلوم کرنے کے کئی قدرتی اصول و طریقے ہیں۔ تو آپ بتایئے کہ جب یہ سارے طریقے' قاعدے اور علامات و نشانات قدرت نے پیدا کئے ہیں اور اسے استعمال کرنے' فائدہ اٹھانے اور اندازہ لگا کر حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت اور عقل و شعور بھی اللہ ہی نے عطا فرمائی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کوئی کسوٹی' معیار و پیمانہ عطا فرما دینے کے بعد یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم سیاہ سفید' اندھیرے اجالے' اچھے برے' اور نر و مادہ کو نہیں

پہچان سکتے؟ یہ سب روایتی عقیدے ہیں جو انسانوں کو کتاب و نور مل جانے کے بعد بھی اسے اندھیروں اور ظلمتوں میں بھٹکائے رکھنا چاہتے ہیں۔

البتہ یہ سچ ہے کہ رحم میں جو کچھ ہے اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیسا ہو گا' کیا کرے گا' نیک ہو گا کہ بد' اس کے اعمال و کردار کیا ہونگے' وہ کس انجام و نتیجے سے دو چار ہو گا' اس کے فیصلے کی گھڑی کب آئیگی اور کس سر زمین پر اسے اپنی گرفت میں لے لیگی۔ ان ساری باتوں کا علم از ابتدا تا انتہا اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اور آیت مذکورہ میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

4- دین اور مذہب

ہفت روزہ ندائے خلافت بابت 27 ستمبر تا 3 اکتوبر 95 کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ یہ مذہب نہیں بلکہ دین ہے جس میں صرف عقائد' عبادات' رسم و رواج ہی نہیں بلکہ اس میں ہمارے لئے معاشرتی نظام' معاشی نظام اور سیاسی نظام بھی ہے۔ نیز زندگی کے یہ چھ کے چھ گوشے (عقائد' عبادات' رسم و رواج' معاشرتی نظام' معاشی نظام اور سیاسی نظام) مل کر دین کہلاتے ہیں۔ ان میں سے پہلے تین گوشے فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں اور دوسرے تین فرد کی اجتماعی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔

دین کے غلبے سے اصلاً" اس کا اجتماعی نظام مراد ہے۔ اسلام کا یہ اجتماعی نظام غالب ہو تو یہ دین کی شکل میں ہوتا ہے ورنہ عملاً مذہب ہی بن جاتا ہے۔ آج دنیا میں کہیں بھی اللہ کا عطا کردہ نظام عدل و قسط قائم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مسلم اکثریت والے ممالک نے بھی اپنا اجتماعی نظام اسلام کے علاوہ کہیں اور سے مستعار لیا ہوا ہے۔ آج اس کو پھر قائم کرنا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کام کیا۔ آپ کے صحابہؓ نے بھی یہی کام کیا اور امت کا بھی یہی کام ہے۔ جو نبیؐ کا مقصد وہ ہمارا مقصد' جو نبیؐ کا طریقہ وہ ہمارا طریقہ۔

نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت قرآن مجید نے غلبہ دین حق ہی قرار دیا ہے اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے اس مشن کی تکمیل فرمائی۔ اسلام میں جہاد و قتال کی غرض و غایت ہی اقامت دین ہے۔ ایمان والوں کو قرآن بار بار مخاطب کر کے پکار رہا ہے کہ اس دین کو قائم کرنے کے لئے اٹھو' جدوجہد کرو۔ جان مال کھپاؤ۔ اس کے بغیر دعویٰ ایمان بے معنی ہے۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے اور اس کی ادائیگی میں ہی تمہاری دونوں جہانوں کی کامیابی مضمر ہے۔

جب بھی لفظ "دین" ہمارے سامنے آتا ہے تو اس سے مراد صرف نماز' روزہ یا خاص وضع قطع نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ نظام عدل و قسط مراد ہوتا ہے۔ یہ چیز کسی قدر واضح ہو کر حدیث میں آئی ہے کہ " بنی الاسلام علی خمس....." یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ وہ پانچ چیزیں کلمہ' نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہی پانچ چیزیں اسلام ہیں بلکہ پورا ڈھانچہ ہے جو ان کے اوپر قائم کیا گیا ہے' اور وہ پورا اجتماعی نظام ہے۔

طلوع سلام :- فیض نے کہا تھا۔

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر دراز

موت کا ایک دن معین ہے؟

(قرآن فہمی کا اصول)

عزیز محترم بشیر احمد عابد صاحب کا عنوان بالا پر مضمون (مطبوعہ شمارہ اکتوبر 1995ء) دقتِ نظر سے پڑھا۔ انہوں نے موضوع زیر نظر اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی پیش کردہ معروضات پر سیر حاصل بحث کر کے قرآن کریم کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب اللہ نے موت کے لئے ایک قانون مقرر کر دیتا ہے تو اس قانون کو ایک طرف رکھ کر اللہ تعالیٰ براہ راست اس میں دخل نہیں دیتا۔ ایسا عقیدہ اللہ کے طریق (سنت اللہ) کے مطابق باطل ٹھہرتا ہے۔

عزیز موصوف کی ہمیشہ یہ منفرد خصوصیت رہی ہے کہ وہ جو کچھ سمجھتے ہیں قرآن کریم ہی سے سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، قرآن کریم کی سند ہی سے کہتے ہیں۔ اور قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ **اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ** (17/9)۔ "یہ قرآن (سفرِ زندگی میں) ایسی راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی اور معتدل (توازن بدوش) ہے۔" قرآنِ کریم سے رہنمائی حاصل کرنے والا کبھی ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے دوسرے مضمون اجلاً" مسمی" میں خود یہ بات لکھی ہے کہ:

"انسان کی موت، دو مختلف وجوہات سے واقع ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک حادثاتی ہے اور دوسری طبعی۔ اول الذکر میں مختلف قسم کی بیماریاں، حادثات اور ماحول کے اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے تفصیلاً" لکھا ہے کہ وہ کون سے حادثاتی یا ماحولیاتی عوارضات ہیں جو انسان کی موت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ:

"مندرجہ بالا موتوں کو علاج معالجہ اور حفظ ماتقدم کے ذریعے روکا جا سکتا ہے یا یوں سمجھئے کہ انسانی موت کے وقت کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔"

یہ ہے ڈاکٹر صاحب کے ان تمام واقعات میں بچ جانے کی "لم" یعنی حفظ ماتقدم۔ اور اسی بات کو بشیر احمد عابد صاحب نے بھی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ امید ہے ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون کو بار دگر بغور پڑھنے کے بعد اپنے بار بار موت سے بچ جانے کی وجہ سمجھ جائیں گے اور اسے اپنے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی براہ راست مداخلت کہنے کی بجائے اپنی احتیاطی تدابیر کا نتیجہ ٹھہرائیں گے۔

اور تو اور، اللہ تعالیٰ تو، دنیائے انسانیت کی سب سے بڑی ہستی حضور نبی اکرمؐ کے لئے بھی (کہ جن کا مقام یہ ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر") اپنے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا (28/56;13/40 وغیرہ) اس کی طرف محترمہ شمیم انور

صاحبہ نے اپنے مضمون میں (مطبوعہ شمارہ ستمبر 1995ء) بالخصوص اشارہ کیا ہے۔

سلسلہ موت و حیات میں قول فیصل وہی ہے جس کا عزیز موصوف نے اپنے مضمون کے آخری حصہ میں ذکر کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ :

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (35/11)

"عمر کے بڑھنے اور گھٹنے کا اللہ نے ایک قانون مقرر کر رکھا ہے اور اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔"

قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کے کسی قانون کے متعلق جب کہتا ہے کہ یہ ایسا کرتا ہے تو ساتھ ہی اس کے متعلق یہ **ضمانت** بھی بہم پہنچاتا ہے کہ **لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33/62)۔ "تم اللہ کے طریق کار (قانون) میں کبھی کہیں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ ہی اس میں کبھی کوئی تحول پاؤ گے **لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا** (35/43)۔

حق تو یہ ہے کہ اللہ بننا چچا ہی ایسی ذات کو ہے جو پورے حتم و یقین سے کہے کہ ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اور اس کی **ضمانت** بہم پہنچائے کہ کچھ بھی ہو جائے، نتائج کبھی اس کے برعکس نہیں نکلیں گے۔ اگر اس کا قانون اس طرح کارفرما ہو کہ کسی ایک کے لئے کچھ، اور دوسرے کے لئے اسی ضمن میں کچھ اور، تو اس جہانِ رنگ و بو کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ قانون کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ :

IF - THEN AND ALWAYS

یعنی اگر یوں کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اور ہمیشہ ایسا کرنے سے ایسا ہی نتیجہ نکلے گا۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاحات، مفردات یا کسی آیت کا مفہوم متعین کرتے وقت قرآن کریم کی تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہئے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھا جانا چاہئے کہ ان کا کوئی مفہوم یا اس کی کوئی تفسیر قرآن کریم کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں **اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا** (4/82)۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کریم کو سمجھتے وقت ذہن کو خارجی اثرات سے الگ رکھا جائے اور "اگر نظر بظاہر یوں لگے کہ قرآن کریم کا ایک مقام، کسی دوسرے مقام سے، ایک ہی ضمن میں کوئی اختلافی بات کہہ رہا ہے تو، فوراً کسی نتیجہ پر پہنچنے کی بجائے، انتظار کرنا چاہئے کہ انسانی علم اس درجہ تک پہنچ جائے جہاں دونوں جگہوں پر کہی گئی بات کا توافق سمجھ میں آجائے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک موضوع پر قران دو متضاد باتوں کو سند دے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا یہی طریق بتایا ہے۔ ارشاد ہے کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41/53)۔

"ہم خارجی کائنات اور انسانوں کی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ بات ان پر ثابت ہو جائے کہ الحق صرف قرآن ہی ہے"۔

میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجا لاتا ہوں

کہ استاد محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ نے قرآن فہمی کی جو منفرد طرح ڈالی تھی' اس کے ثمرات میں عزیز محترم بشیر احمد عابد جیسے تلامذہ سامنے آرہے ہیں۔ میں عزیز موصوف کو ان کی اس مدلل تحقیقی کاوش پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کے ذوق اور فہم قرآنی کو چار چاند لگائے کہ قرآن کریم ہی کا جادۂ مستقیم وہ راہ ہے جس پر چل کر انسانیت بالعموم اور امت مسلمہ بالخصوص نشأۃ ثانیہ پا سکتی ہے۔ قرآن سے ہٹ کر جب بھی کسی مسئلے کا حل سوچا جائے گا' انسانی فکر ٹھوکر کھائے گی۔ اس پر زمانہ کی تاریخ شاہد ہے۔

اللہ تعالیٰ' ہم سب کو اپنی آخری کتاب کی عظیم آیات سمجھنے کے لئے یہ سعادت بخشے کہ ہم انہیں قرآن ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سمجھ سکیں اور ان پر کسی خارجی عنصر' واہمے یا اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثاتی اتفاقات کو اثر انداز نہ ہونے دیں۔ کیونکہ صرف اسی طریق سے قرآن کریم ہمارا رہنما بن سکتا ہے اور یہی سنت رسولؐ اللہ بھی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ -(7/203)

اے رسولؐ ! ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے نشوونما دینے والے کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ ضابطہ' قوانین' تمام دنیا کے انسانوں کے لئے بصائر و دلائل کا مجموعہ ہے اور جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں' ان کے لئے یہ ہدایت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔

وضاحت

"موت کا اک دن معین ہے؟" کے عنوان کے تحت ہمیں درج ذیل کرمفرماؤں کی طرف سے بھی مضامین موصول ہوئے ہیں لیکن چونکہ اس موضوع پر ہم اب تک بہت سے مضامین شائع کر چکے ہیں اس لئے دلائل کی مزید تکرار چنداں سود مند نہ ہو گی لہٰذا سردست یہ سلسلہ مضامین بند کیا جا رہا ہے۔

جناب محمد اسلم رانا صاحب۔ جناب محمد لطیف چوہدری صاحب۔ جناب توفیق صاحب۔ جناب غلام محمد غلام صاحب۔ جناب تنویر قمر دانش صاحب۔ جناب سلیم قیوم صاحب۔ جناب عبدالمجید انصاری صاحب۔ جناب احمد اشرف صاحب۔ جناب شفیق صاحب۔ جناب نثار احمد چوہدری۔ جناب ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب۔ جناب میجر کلیم احمد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد جیلانی قریشی

صُورت گری

"وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی قلعے اور مجسّمے..." قرآن (سورۃ سبا (34) کی آیت 13) قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب مصوروں ہی کو ہو گا..... حدیث (بخاری)

یہ شناخت کا زمانہ ہے۔کوئی بھی اجنبی آپ سے روابط بڑھانے سے پہلے آپ کی شناخت طلب کرے گا۔ چاہے آپ ملازمت کی درخواست دیں یا شناختی کارڈ بنوائیں، تصویر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر نہ پاسپورٹ کا تصور ہے اور نہ ویزہ کا، دوسری دستاویزات کی بھی بغیر تصویر کے کوئی قیمت نہیں۔ شادی کی بھی کہیں بات چلتی ہے تو تصویروں کا تبادلہ پہلے ہوتا ہے۔ اتنی ضروری اور بے ضرر چیز کو اسلام کے بعض علماء ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ پھر سائنس جو فطری اصولوں پر کاربند ہے۔ اس سے اجتناب چہ معنی دارد۔ جو علماء تصویر کو حرام قرار دیتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ بعض احادیث میں تصویر کی ممانعت ملتی ہے۔

اس کی رو سے بعض علماء کے نزدیک تصویر حرام قرار دے دی گئی۔ جہاں تک حدیثوں کی اصلیت کا تعلق ہے اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے جو احادیث اور روایات کو پرکھنے کے لئے ایک میزان، ایک پیمانہ اور ایک کسوٹی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بتا دی ہے۔ حدیث بخاری کے الفاظ میں۔

"میرے بعد حدیثوں کی کثرت ہو گی تو جو حدیث میری طرف منسوب کر کے تمہارے سامنے روایت کی جائے اس کو قرآن کے سامنے پیش کرو اگر اس کے موافق پاؤ تو قبول کر لو اور اگر اس کے مخالف پاؤ تو رد کر دو۔"

اسی میزان، اسی پیمانے اور کسوٹی کو بنیاد بنا کر بہت سے علماء نے تحقیق کر کے لاتعداد حدیثوں کی نفی کر دی۔ فی الوقت ایک مثال پر اکتفا کروں گا وہ یہ کہ تمام دنیا جہان کے مسلمانوں میں امام مہدی کے ظہور اور عیسیٰ کے نزول کا عقیدہ راسخ ہے۔ اتنا راسخ ہے کہ اس کے بغیر مسلمان کا ایمان مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی حوالے سے لاتعداد حدیثیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ جدید تحقیق کی رُو سے ان تمام حدیثوں کو من گھڑت قرار دے دیا گیا۔ اسی حوالے سے حضرت علامہ تمنا عمادی کی کتاب "انتظار مہدی و مسیح" دیکھی جا سکتی ہے۔ جن محققین نے ظہور امام مہدی اور نزول حضرت عیسیٰ کو بے بنیاد قرار دے دیا ان میں سرسید احمدؒ خان، مولانا عبیداللہؒ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے دانشور شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے تو

یہاں تک کہہ دیا۔

میناِر دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اب انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

جب اتنی مشہور حدیثیں اور راسخ عقائد والی حدیثوں کو ہی بے بنیاد قرار دے دیا گیا پھر دوسری لاتعداد حدیثوں کا کیا بنے گا جو قرآن کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں؟ پھر بھی کیا ہر ایک حدیث کو آنکھ بند کر کے مان لیا جائے یا اس کو پرکھ کر دیکھا جائے۔ اور حدیث کو پرکھنے کا فارمولا بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دے گئے ہیں یعنی وہی حدیث جو پہلے بتا دی گئی یعنی حدیث کو اگر قرآن کی تعلیمات کے مطابق پاؤ تو قبول کر لو اگر مخالف پاؤ تو ردّ کر دو۔ لہٰذا ہم نے پورا قرآن چھان ڈالا دو ٹوک الفاظ میں تو کجا پورے کلام الٰہی میں اشارتاً" خواہ صراحتاً" اور کنایتاً" بھی صورت گری کے خلاف کوئی بھی مواد نہیں ملتا ہاں البتہ ایسی آیات ملتی ہیں جس سے حدیثوں کی پوزیشن اور واضح ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ

"ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔" (سورہ انعام (6) آیت 38) اور

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ

"اے رسول ! اور ہم نے اس کتاب کو تم پر (دین) کی ہر چیز صاف طور سے بیان کر دینے کے لئے اتارا ہے۔" (سورۃ نحل آیت 89)

ان آیات پر اگر غور کریں تو یہ بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن شریف اسلامی عقائد کا واحد مرجع اور منبع ہے۔ حدیث صرف اس کی تشریح کا کام دے سکتی ہے۔ قرآن سے الگ کوئی نظریہ لاگو کرنا حدیث کا کام نہیں۔ اس سے پیشتر کہ لوگ مجھ پر منکرِ حدیث کا ٹھپا لگا دیں اور میرا منشاء بھی نہیں کہ میں منکرِ حدیث کہلاؤں لہٰذا میں ایسی روایات بھی پیش کروں گا جن سے تصویر کی اباحت (جائز ہونا) ثابت ہو لیکن اس سے پہلے جب میں نے دعویٰ کیا کہ قرآن مجید جو دین کا اصل ماخذ ہے ایسا کوئی مسئلہ نہیں چھوڑا جس کا تعلق رہتی دنیا تک نہ ہو' لہٰذا جب صورت گری کی مخالفت میں کوئی مواد نہ مل سکتا تو پھر ایسی ضرور کوئی آیت ہو گی جس سے صورت گری کی گنجائش نکلتی ہو لہٰذا میں سورۃ سبا کی آیت 13 پیش کرتا ہوں جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

"وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی قلعے اور مجسّمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی ہیں' اے داؤد کی اولاد (میرا) شکر کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔" اس آیت میں لفظ تماثیل کا ترجمہ بعض مفسروں نے تصویریں کیا ہے اور بعض نے مجسّمے۔ پکتھال نے انگریزی میں جو ترجمہ کیا ہے لفظ تماثیل کا انہوں نے Statues کیا ہے۔ بہرحال مجسّمے ہوں یا تصویریں دونوں کا تعلق صورت گری ہی سے ہے۔ یہ تماثیل جنات بناتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اس آیت سے صورت گری کی اباحت (جائز ہونا) ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا جو حدیث اوپر پیش کی گئی چونکہ مخالف کلام اللہ ہے لہٰذا اصول تضیع کے تحت مسترد کی جا سکتی ہے بلکہ صرف یہی ایک حدیث

نہیں، جتنی بھی حدیثیں تصویروں اور صورت گری کی ممانعت کرتی ہوں سب کی سب ردّ کی جا سکتی ہیں۔ یہ تو رہا قرآن اور حدیث کا ٹکراؤ۔ اب رہی تاریخ کی بات تو تاریخ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور سے ہی مصوری اور صورت گری مسلمانوں کے ایک طبقہ میں رائج رہی۔ مثلاً :-

1- **حضرت عروہ کا نگار خانہ** :- عفان بن مسلم، حماد بن سلمہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں حضرت عروہ کے بیٹے ہشام نے بتایا کہ حضرت عروہ ہمیشہ ریشمی بٹنوں والا طیلسان پہنا کرتے تھے جس پر انسانی چہرے پرنٹ شدہ ہوتے تھے اور حالت احرام میں ہوتے تو بٹن کھلے رکھتے۔

2- **قاسم بن محمد کا ذوق جمال** :- صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے جناب قاسم بن محمد کے گھر ابن عون گئے تو حضرت قاسم گھر کے ایک کونہ میں موجود تھے۔ ابن عون کہتے ہیں کہ میری نظر جناب قاسم کے گھر کی مچھر دانی پر گئی جس پر خیالی پرندے اور دریائی کتوں کی تصویریں پرنٹ شدہ تھیں۔

3- **سکّوں پر تصویریں** :- عبداللہ بن زبیر کے عہد حکومت میں جو سکے رائج تھے مصعب بن زبیر کی تصویر بحیثیت خلیفہ کے نمائندہ سکہ کے ایک طرف نقش تھی جس میں آپ کی گردن میں تلوار حمائل تھی اور آپ کھڑے نظر آتے تھے۔

4- **نبی علیہ السلام نے تصویری انعام دیا** :-

ابن سعد اپنی سند کے ساتھ رقمطراز ہیں کہ نبی علیہ السلام کے چچا جناب عقیل بن ابی طالب نے جنگ موتہ 8ھ میں ایک کافر سے انگوٹھی چھینی جس پر مورتیاں ڈھلی ہوئی تھیں۔ آپ نے یہ انگوٹھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے محفوظ رکھا اور جنگ کے خاتمہ پر کفار کا دیگر اثاثہ جب تقسیم ہونے لگا تو اس انگوٹھی کو انعام کے طور پر اپنے چچا کو ہی ارزاں فرمایا اور یہ انگوٹھی تھی جسے زندگی بھر حضرت عقیل پہنتے رہے اور کبھی نہیں اتاری۔

❁ (روایت کے ایک راوی) جناب قیس بن ربیع اسدی (متوفی 166ھ) کہتے ہیں کہ میں ان خوش قسمت انسانوں میں سے ہوں جنہیں بعد میں اس نبوی انگشتری کو دیکھنے کا شرف نصیب ہوا۔

5- **ابن عباس کی مورتیوں والی انگیٹھی** :-

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ جناب مسور بن مخرمہ حضرت عبداللہ بن عباس کی بیمار پرسی کے لئے جب ان کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ آپ ریشمی چادر اوڑھے ہوئے مورتیوں والی انگیٹھی پر آگ تاپ رہے تھے۔ مسور نے کہا کہ یا ابن عباس یہ کیا ہے؟ آپ نے جواباً فرمایا کہ جہاں تک ان اشیاء کے استعمال کا تعلق ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن وجوہ کے پیش نظر منع فرمایا تھا ان میں بنیادی وجوہ تکبر، غرور میں مبتلا ہونا بھی تھا اور اللہ کا شکر ہے ابن عباس ان رذیل خصلتوں سے پاک رہا ہے۔

6- کاتب الوحی کی تصویر :- کاتب الوحی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اسلامی دینار ڈھالے تو ان کے ایک رخ پر کھڑی حالت میں اپنی مورتی ڈھلوائی- اس میں آپ تلوار حمائل کئے ہوئے تھے-

ان روشن دلائل' کھلے انکشافات اور عملی تحقیق کے بعد اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی تصاویر سے منع فرمایا تھا تو پرلے درجے کا ہٹ دھرم ہی ہو گا اور ہٹ دھرم بھی ایسے بے غیرت ہٹ دھرم کہ تصویر کو حرام قرار دیتے ہیں لیکن اپنی تصویریں اخبارات' رسائل اور پوسٹروں میں چھپوانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے- ان کی مثال ان عیسائی راہبوں جیسی ہے جنہوں نے مسلکِ رہبانیت خود ہی ایجاد کر لیا- خدا نے ان پر فرض نہیں کیا تھا اور پھر اسے نباہ بھی نہ سکے- (قرآن 57:27) غیر فطری عمل پر نباہ کیسے ہو سکتا ہے-

(مزید تفصیلات کیلئے علامہ رحمت اللہ طارق کی کتاب منسوخ القرآن دیکھی جا سکتی ہے- ملنے کا پتہ ادبیات اسلامیہ پاک گیٹ' ملتان)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے-

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال- زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ-	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعۃ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر- جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ' مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں-

رابطہ :

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر' بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون : کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مزمل حسین بخاری- ناروے

یہ تبلیغی جماعتیں!

اسلام کے خلاف ایک سازش؟

70/71 کی دہائی میں پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد حصول روز گار کی خاطر جرمنی میں مقیم تھی- ہر کوئی برطانیہ جانا چاہتا تھا لیکن انگریز بہادر نے اپنی سرحدوں پر کڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں- ویزا ہاتھ میں لئے ایک صاحب اچانک نمودار ہوئے- پوچھا! یہ ویزا کیسے مل گیا- کہنے لگے No Problem- میں قادیانی ہوں- ہمارا امام ہمیں ایک تعارفی رقعہ دے دیتا ہے- لندن ایئر پورٹ پر موجود حکام یہ رقعہ دیکھ کر ہمیں انٹری ویزا دے دیتے ہیں- پچھلے دنوں ناروے ہی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی- پوچھا بھائی! ناروے کا ویزا کیسے حاصل کیا- کہنے لگے کوئی مشکل نہیں- میرا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے اور ہم دنیا کے ہر ملک کا ویزا حاصل کر سکتے ہیں- اگلے دن اسی طرح ایک پیر صاحب سے ملاقات ہوئی- دوران گفتگو فرمانے لگے- ہماری گدی کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ انگریز مجسٹریٹ بذات خود رسم دستار بندی میں شرکت کیا کرتے تھے-

سوچتا ہوں- آپ بھی سوچئے- کہ جہاں کوئی دوسرا مسلمان پر نہیں مار سکتا وہاں قادیانیوں- پیروں اور تبلیغی جماعت والوں پر اہل یورپ کی یہ نظر کرم کیوں؟

تاریخ کا تھوڑا سا مطالعہ کریں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے- کل ہی کی بات ہے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت قرآن ہاتھ میں لئے صحرائے عرب کی چھوٹی سی بستی سے اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بحر و بر پر چھا گئی- یہ بات سمجھنی اہل یورپ کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ یہ اعجاز عربوں کا نہیں یہ فیض اس کتاب کا ہے- اس نظام کا ہے جو اس کتاب نے عطا کیا ہے- اس ایمان کا ہے جو اس کتاب نے پختہ کیا ہے- اس جذبہ جہاد کا ہے جو اس کتاب نے مسلمانوں میں ابھارا ہے- یہاں تک پہنچے تو انہیں ایران کے شکست خوردہ گورنر ہرمزان کا یہ قول یاد آیا کہ جب تک مسلمانوں کے ساتھ ان کا قرآن ہے دنیا کی کوئی قوم انہیں شکست نہیں دے سکتی- قرآن پر ہاتھ ڈالنا اقوام یورپ کے بس میں نہ تھا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے- ایک راہ البتہ ان کے لئے کھلی تھی وہ یہ کہ قرآن کو کسی طرح مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے- پروگرام یہ بنایا گیا کہ-

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

چنانچہ اس کے لئے مسلمان علماء خریدے گئے- خود عیسائی علما' مسلمانوں کا مروپ دھار کر ان کی صفوں میں شامل ہو گئے- اور تبلیغ دین کے نام پر احادیث

اور روایات کے غیر محکم دروازوں سے یہ لوگ ملّتِ اسلامیہ میں داخل ہو گئے۔ نظامِ خانقاہیت کو اتنا ابھارا کہ انگریز مجسٹریٹ ان کی دستار بندیوں میں شامل ہونے لگے۔

جرأتیں اتنی بڑھیں کہ منصبِ نبوّت پر ڈاکہ ڈالنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ قادیانیوں پر نوازشات اور نام نہاد تبلیغی جماعتوں پر عنایات کی بارش ہونے لگی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

قادیانیوں کے متعلق تو مسلمانانِ عالم کو اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی کہ وہ جو کچھ بھی ہیں بہرحال مسلمان نہیں ہیں لیکن ان لوگوں کی نقاب کشائی بہرحال ضروری ہے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اہلِ مغرب سے ویزے حاصل کر رہے ہیں۔

کاندھے پر بستر اٹھائے یہ لوگ قریہ قریہ، بستی بستی، روایات کی آڑ میں ایسے نظریات کا پرچار کرتے ہیں جن سے مسلمان قرآن سے یکسر کٹ کر رہ گئے ہیں۔ ان کا لٹریچر دیکھئے۔ ان کی تعلیمات پر نگاہ دوڑائے۔ ان کی کورس کی کتابیں پڑھئے۔ حقایات صحابہ کے عنوان سے ان کی ایک کتاب ہے۔ اس کی جلد پنجم دیکھنے کا اتفاق ہو، تو بدنام زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" کا مصنف آپ کو ان حضرات سے کم گنہگار نظر آئیگا یہ لوگ آج کل تحفے کے طور پر قرآن پاک کے نسخے بھی بانٹ رہے ہیں۔ جن کے حواشی دیکھ کر یہ نسخے تقسیم کرنے کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ مقصد یہاں بھی عوام کو قرآن کی محکمیت سے دور بھگانا ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان مبلغین اسلام سے محفوظ رکھے کہ کہیں شعوری طور پر، کہیں غیر شعوری طور پر مسلمانوں کو خالص قرآنی فکر سے دور رکھنا ہی ان لوگوں کا مقصد و مسلک ہے۔

بات اب سمجھ میں آئی کہ ویزے دینے کے لئے اہل یورپ ان لوگوں پر مہربان کیوں ہیں؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ یورپ میں مقیم مسلمان گھرانے جوں جوں قرآن کی طرف رجوع کر رہے ہیں، انہیں فکر ہو رہی ہے کہ ؎

یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اپنے ہاں کے مشنری اداروں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا انہیں بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ یہ مقصد ان لوگوں کو ویزا (Visa) دیکر پورا کر لیتے ہیں۔

نتیجہ دیکھنا ہو اس رات سے اگلے دن کا اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے جس رات یہ حضرات یورپ کی کسی مسجد میں تبلیغی فریضہ ادا فرماتے ہیں۔ اس محلے کے مسلمان یا تو ایک دوسرے کے پیچھے لٹھ لئے پھر رہے ہوتے ہیں یا مسجدوں کو تالا لگ جاتا ہے۔ اور یہی کچھ تو ہے جو مغربی اقوام چاہتی ہیں۔

The bones of a "dead saint" are of no practical use to humanity — a philosopher.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انجم اقبال فریدی

موت کا اک دن معین ہے؟

اگست 95ء کے طلوع اسلام میں محترم ڈاکٹر عبدالودود کا مضمون بعنوان موت کا اک دن معین ہے؟ نظر سے گذرا۔ موصوف نے سورہ آل عمران کی آیت نمبر 145 کے حوالے اور اپنی گذشتہ زندگی کے چند واقعات کی رو سے' اظہار خیال فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا ارادہ تو میں اسے پڑھنے کے دوران ہی کر چکا تھا لیکن اس کی آخری سطر' جس میں ڈاکٹر صاحب نے قارئین طلوع اسلام کو دعوت اظہار دی تھی کو پڑھنے کے بعد' اس مسئلے پر بساط بھر روشنی ڈالنے کا فیصلہ کیا۔

میری ناقص رائے میں جن دو آیات یعنی 3:145 اور 22:65 کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کیا ہے' ان میں لفظ 'اذن' سے مراد قانون ہو یا حکم ہر دو صورتوں میں ان آیات کی تشریح میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس لطیف نقطہ کو سمجھنے کیلئے آیئے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں الفاظ کے لغوی معنی کیا ہیں۔

لفظ قانون یا Law کی تعریف (Definition) آکسفورڈ ڈکشنری کی رو سے درج ذیل ہے:

Rule made by authority for the proper regulation of a community or society or for correct conduct in life.

جبکہ لفظ حکم یا Order کیلئے اس ضمن میں مندرجہ ذیل بیان ہے:

Rules (accepted e.g., in a Parliament) enforced by a president, chairman or other autohority.

چنانچہ مندرجہ بالا Definitions سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ تمام قاعدے اور قوانین کہ جو خالق نے اس کائنات کی تخلیق اور بقا کیلئے وضع فرمائے' کن کے حکم کے ساتھ ہی اپنی تمام تر پیچیدگیوں اور لطافتوں کے ساتھ ابد تک کیلئے Enforce ہو گئے۔

قانون اور حکم کا لطیف تعلق محسوس (Perceive) کرنا مشکل کچھ اس لیے بھی ہے کہ انسان نے اپنے ہاں قوانین اور احکام میں اس قدر فاصلہ پیدا کر دیا ہے کہ بسا اوقات یہ ایک دوسرے کی ضد محسوس ہوتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد آئے دن قوانین اور ضابطے تشکیل پاتے رہتے ہیں' modify ہوتے رہتے ہیں' کبھی لاگو ہوتے ہیں تو کبھی ٹوٹتے ہیں اور وہ authorities جو انہیں enforce کرنے کا حکم صادر فرماتی ہیں خود ہی ان کی دھجیاں بکھیرتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور تو اور ہم نے قدرت کے احکامات کو' جو کہ دراصل قوانین ہی ہیں یعنی دین کو بھی مذہب کی صورت میں violate کر کے رکھ دیا ہے اور اس طرح سے خدا کے قانون اور حکم میں بہت بڑا بعد پیدا کر دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عدل و انصاف خدا تعالیٰ کا قانون ہے لیکن اس امید پر ہر طرح کی برائیاں اور حکم عدولیاں (یعنی قانون شکنیاں) کیئے جاتے ہیں کہ پتہ نہیں کب خدا کا حکم ہو جائے اور ہم سدھر جائیں اور اگر سدھر نہ بھی

سکیں تو کیا ہوا امت رسولؐ ہونے کے ناطے بخشش کا حکم تو ہے ہی۔

قانون اور حکم کے اس بنیادی تعلق (یعنی خدا کا ہر حکم ایک اٹل قانون ہے) کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم پہلے حوالہ شدہ آیات اور پھر ڈاکٹر وودو صاحب کی زندگی کے ان واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ جن کا تذکرہ انہوں نے فرمایا ہے۔

وما کان لنفس ان تموت الا باذ ن اللہ کتبا" موء جلا" ○

"کسی شخص میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کے اذن کے بغیر مرجائے' اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے"۔

مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں اذن سے مراد چاہے حکم لے لیجئے یا قانون اصل بات یہ ہے کہ موت جب بھی اور جہاں کہیں بھی واقع ہو گی خدا تعالٰی کے ان اٹل قوانین ہی کے تحت ہو گی کہ جو اس ضمن میں کائنات میں ہر وقت اور ہر جگہ احکام الٰہی کی صورت میں لاگو ہیں۔ زندگی جن حیاتیاتی' طبیعیاتی' کیمیاوی اور میکانکی مساواتوں (equations) یا قوانین کا مجموعہ ہے اور موت ان میں جس بھی سطح پر بگاڑ (imbalance) سے واقع ہو سکتی ہے' سب اس قدر تفصیلی طور پر operative ہیں کہ کوئی بھی ذی روح جب بھی دانستہ یا نادانستہ (طبعی یا حادثاتی) طور پر زندگی کے موجب قوانین میں بگاڑ کا سبب بنے گا بیماری یا موت کا شکار ہو جائے گا۔

یہاں ضمنا" یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جیسے دانستہ طور پر حکم عدولی یا قانون شکنی جرم ہے اسی طرح جانتے ہوئے کوئی ایسا عمل کرنا کہ جس سے زندگی کی اساسی مساواتوں میں بگاڑ پیدا ہو اور موت واقع ہو جائے (خود کشی) حرام موت کے مترادف ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص دانستا" اپنے آپ کو ختم کر لیتا ہے تو کیا وہ خدا کے حکم یا قانون کے بغیر مر جاتا ہے؟ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ خدا کے قوانین ہر وقت اور ہر جگہ لاگو ہیں اور ان کے ساتھ Interaction میں ہمیشہ وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ جس کیلئے وہ programmed ہوتے ہیں۔ چنانچہ خودکشی اس لحاظ سے تو قانون شکنی ہے کہ خالق کے طبعی قوانین کی رو سے وہ شخص اس قابل تھا کہ مزید اور زندہ رہ سکتا لیکن موت کا واقع ہونا انہی قوانین ہی کے تحت ہو گا کہ جو اس کیلئے خالق نے وضع فرمائے ہیں۔

خدا تعالٰی کے اذن (احکام/قوانین) سے متعلق ایک اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت Dynamic ہیں اور ہر قانون چھوٹے چھوٹے مزید کئی قوانین کا مجموعہ ہے اور بہت سے عوامل (Factors) سے مشروط بھی۔ بسا اوقات کسی ظاہری قانون کے بنیادی اجزا اور diversity of associated factors involved نظر سے اوجل ہوتے ہیں یا ہنوز discover نہیں ہوئے ہوتے چنانچہ میرے خیال میں ایسے ہی Phenomenon کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ یہاں معجزہ سے میرا خیال قانون اور حکم کے باہمی تعلق کے تذکرہ کی طرف جاتا ہے جسے ضمنا" بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

فیروز اللغات میں الحاج مولوی فیروز الدینؒ صاحب معجزہ کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں فرماتے ہیں:

وہ کام جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ (یہاں تک تو چلیں مان لیا) وہ خلاف قانون قدرت بات جو

نبی سے ظاہر ہو۔

دراصل یہی اور اس طرح کے دوسرے کئی غلط العام غیر قرآنی concepts ہی تو ہیں جو ہماری فکر کو غیر محسوس طریقے سے متاثر کرتے ہیں۔ میرے خیال میں معجزات بھی عین بمطابق قانون قدرت ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی وضاحت ظاہری یا سائنسی خطوط پر کرنے سے کسی طور قاصر ہوتے ہیں۔

آیئے اب دوسری آیت مبارکہ کو دیکھتے ہیں۔

"وہ آسمان کو تھامے رکھتا ہے کہ اس کے اذن کے بغیر نہ گرے" (22:65)

(ارب ہا ارب آسمانی کرے ہیں لیکن کوئی کسی سے نہیں ٹکراتا۔ اگر کوئی ٹکراؤ ہوتا بھی ہے تو وہ بھی قانون کے مطابق)۔

اس آیت کی تشریح کے سلسلے میں بھی اگر قانون اور حکم کے بنیادی تعلق کو ذہن میں رکھا جائے تو کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ اس آیت میں آسمان سے مراد بارش لی جائے یا پھر ستاروں اور سیاروں کے بارے میں سمجھا جائے کیونکہ دونوں صورتوں میں جس بات پر stress مقصود نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ کائنات کے ہر نظام میں خدا تعالیٰ کے اٹل قوانین' احکام کی صورت میں جاری و ساری ہیں۔ بارش کا برسنا ہو یا ستاروں اور سیاروں کے نظام کا قائم رہنا سب کچھ' بے شمار قسم کے قوانین قدرت ہی کا مرہون منت ہے۔ سمندر کے پانی کا ایک قطرہ جب ایک خاص درجہ حرارت پر اپنی ہیئت میں تبدیلی سے فضا میں شامل ہو کر ایک خاص قانون قدرت کے تحت خاص قسم کے حالات میں اپنے لئے موجود ایک حکم الٰہی کی بجا آوری کرتا ہے تو بادل بن جاتا ہے اور پھر جب بادل برسنے کیلئے ضروری عوامل ملتے ہیں تو بارش کی صورت میں برسنے کا حکم بجا لاتا ہے۔

اسی طرح ستاروں اور سیاروں کے لامحدود سلسلے جن Electro-megnetic قوانین کی بدولت معلق ہیں اور اپنی اپنی گردش کے دوران خلا میں کسی ایک نقطے کو اپنی اپنی Timing کے مطابق قطع کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے تو یہ سب بھی خدا تعالیٰ کے اٹل قوانین میں چھپے احکامات کی بجا آوری ہی سے مشروط ہے۔

اب چند باتیں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے اپنی زندگی سے بیان کردہ واقعات کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہوں گا۔ اگر ہر واقعہ کا علیحدہ سے تفصیلی تجزیہ کیا جائے (جو کہ میرے خیال میں کافی حد تک ممکن ہے) تو بات بہت لمبی ہو جائے گی چنانچہ میں ان واقعات میں موجود ایک دو بنیادی Themes ہی کے حوالے سے کچھ کہوں گا:

ان واقعات میں ایک بنیادی پہلو حادثات سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انسانی زندگی کے حوالے سے دو نظریات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے ایک نظریہ پرویزؒ صاحب کا ہے جس کی رو سے انسانی زندگی کا گھٹنا یا بڑھنا cause & effect کا مسئلہ ہے۔ کون کتنی عمر جیتا ہے اور کس کی عمر میں کمی آجاتی ہے اللہ کے مقرر کردہ قوانین طبعی کے مطابق ہوتا ہے اگر قانون طبعی کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو عمر بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو عمر گھٹ جاتی ہے جبکہ دوسرا نظریہ

یہ تھا کہ یوں تو یہ درست ہے کہ زندگی کی مدت کا انحصار طبعی قوانین کے مطابق زندگی گذارنے پر ہے لیکن یہ نظریہ حادثاتی موت پر لاگو نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں over simplification کی وجہ سے دونوں نظریات میں چند ایک باتوں کی وضاحت نہیں پائی جاتی جو اس confusion کا سبب بنتی ہے' جس کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے۔

حادثہ کسی ایسے اچانک (عموماً undesireable) واقعہ کو کہتے ہیں کہ جس کی کوئی پہلے سے معلوم وجہ نہ ہو۔

مثلاً اگر کوئی شخص کسی سڑک کو چلتی ہوئی ٹریفک کے دوران پار کرنا چاہے تو اگر تو وہ قوانین قدرت کے مطابق چلے گا تو کسی ایسے وقفہ کا انتظار کرے گا کہ جب سڑک نسبتاً" خالی ہو یا پھر دونوں طرف دیکھتے ہوئے اور دونوں طرف سے آتی ہوئی ٹریفک کی رفتار کا اندازہ لگاتے ہوئے (بشرطیکہ اس کی دیکھنے کی قوت اور اندازہ لگانے کی صلاحیت اس خاص لمحے normal ہو) کبھی رکتے ہوئے' کبھی چلتے ہوئے بخیر و عافیت سڑک پار کر جائے گا۔ لیکن اگر کسی بھی وجہ سے (مثال کے طور پر اگر وہ بچہ ہے یا پاگل ہے اور اسے اس بات کا علم ہی نہیں کے وہ کچلا جا سکتا ہے یا کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر یا کسی بیماری کی وجہ سے اس کی precision میں کمی آچکی ہے یا پھر کسی بھی موقع پر double mindedness کی وجہ سے) کسی ایسے نکتہ پر آجائے جہاں جیومیٹری کے قوانین کی رو سے وہ کسی سواری کی زد میں آجائے اور اس سواری کا چلانے والا بھی کسی طور اس اچانک صورت حال پر قابو نہ پا سکے (یہاں driver کے سلسلے میں بھی بہت سے unseen factors کارفرما ہیں) تو پیدل چلنے والے اس شخص کا زخمی یا ہلاک ہو جانا حادثاتی ہو گا اور اس کا انحصار حادثے کی شدت اور جائے حادثہ کے قریب یا دور موجود طبی سہولتوں اور ان کے معیار پر ہو گا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے انہی قوانین کی رو سے ہو گا کہ جن پر دانستا" یا نادانستا" عمل کرتے ہوئے ہم حادثات سے محفوظ رہتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح کسی بھی مقام پر قوانین قدرت کا ایک خاص pattern ہمیں حادثہ سے بچاتا ہے اسی طرح کسی دوسرے مقام پر انہی قوانین کا ایک دوسرا pattern حادثہ کا موجب ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ حادثات بھی طبعی قوانین ہی کے تابع ہیں۔ جس طرح حادثہ کی فوری طور پر کوئی وجہ نہیں ملتی اسی طرح سے حادثہ میں بچ جانے پر بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی وجہ زندگی کیلئے کارفرما بے شمار عوامل اور قوانین ہیں اور حادثے میں زندہ رہنے یا مر جانے کی صورت میں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ان قوانین میں کس سطح پر کیا ہوا؟ آیئے اس بات کو ایک مثال کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر ہم اس بات کا بغور جائزہ لیں کہ دوران سفر حادثات میں کون کون سے عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں تو وہ چند موٹے موٹے عوامل جو میرے ذہن میں آتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں جو کہ دوران سفر ہر لمحہ سے مشروط ہیں یعنی Relative ہیں:

ڈرائیور کی ذہنی اور جسمانی صحت' اس کی جذباتی حالت (emotional state)' ذہانت' ہوش و حواس (Level of wakefulness & alertness)' مہارت' قوت فیصلہ' مختلف الانواع صورت حال سے

نمٹنے کی صلاحیت اور تجربہ' فوری رد عمل اور سڑک پر چلنے والے دوسرے ڈرائیور حضرات کے ساتھ انہی خطوط پر Interaction وغیرہ وغیرہ۔

گاڑی (vehicle) کے مختلف Systems کی عمومی حالت اور باہمی ربط' کسی بھی حصے کی کارکردگی میں اچانک تبدیلی (مثلاً ٹائر کا پھٹ جانا' ٹائی رآڈ کا کھل جانا' کاربوریٹر میں کچرا آجانے سے رفتار میں اچانک کمی واقع ہو جانا) اور ڈرائیور کا ایسی صورت حال سے نمٹنے کا اختیار اور مہارت وغیرہ۔ علاوہ ازیں جیومیٹری کے قوانین جو کہ سڑک پر ہر جگہ operative ہیں' ماحولیاتی عوامل (مثلاً دھند' بارش' سورج کی چمک) اور پھر علی ہذا القیاس بے شمار چھوٹے چھوٹے عوامل جو کہ مندرجہ بالا عوامل کو Determine کرتے ہیں۔

اس سری تفصیل سے اس لطیف نقطہ کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ کسی بھی موقع پر خدا کے اٹل قوانین کی ہمہ جہتی ہی ہے جو کسی نہایت خطرناک صورت حال سے بچ نکلنے یا حادثہ کا شکار ہو جانے کی وجہ پر سوالیہ نشان ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن فہمی کے باوجود مذہبی ضعیف الاعتقادی کا دھواں غیر محسوس طور پر ہماری بصیرت کو متاثر کر دیتا ہے اور ہمیں اٹل حقائق دھندلے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

میری ادنیٰ رائے میں زندگی اور موت cause & effect ہی کا مسئلہ ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اٹل قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔

ضروری وضاحت

قارئین کی طرف سے ہمیں ایسے خطوط بکثرت ملتے ہیں کہ تبلیغ کے سلسلہ میں انہیں فلاں فلاں موضوع پر معلومات درکار ہیں جو اگر فراہم نہ کی گئیں تو طلوع اسلام کی سبکی ہو گی۔ ایسے سوالات یا تو فروعی نوعیت کے ہوتے ہیں یا محض کج بحثی کے لئے۔

ہماری اپنے قارئین سے گذارش ہے کہ وہ لوگوں سے بحث میں نہ الجھا کریں اور اگر ان کا ذوق انہیں اس پر مجبور ہی کرے تو براہ کرم بحث کو اسی حد تک لے جایا کریں جہاں تک ان کا اپنا علم ان کی رہبری کرے۔ طلوع اسلام کے پاس اتنا فاضل وقت اور توانائی نہیں کہ وہ ایسے امور میں لوگوں سے بحث میں الجھے یا ان بحثوں کے لئے مواد بہم پہنچائے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ یہ بحثیں بالکل بیکار ہیں۔

اگر قارئین قرآن کا پیغام دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ اس مثبت پیغام کو پہنچائیں جو "نظام ربوبیت" کی صورت میں ان کے پاس موجود ہے۔ فروعی مسائل میں الجھنا نہ ان کے لئے مفید ہے نہ ادارہ طلوع اسلام کے لئے کارآمد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد شبیر احمد خاں

چُبھتے سوال!

وہ سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا اور اپنے اردگرد کے حالات و واقعات پر غور کر رہا تھا۔ چند ایک سوالوں نے اس کی دماغی قوتوں کو جکڑ رکھا تھا وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ ہم آخر کس سمت سفر کر رہے ہیں؟ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے ہم نے بحیثیت ایک قوم کیا منصوبہ بندی کی ہے؟ کیا ہم نے کوئی لائحہ عمل مرتب کیا ہے کہ جس روشنی میں اپنا سفر طے کریں گے؟ یا پہلے کی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔

وہ یہ سوچ کر حیران و پریشان ہو جاتا کہ ہم خدا کی عطا کی ہوئی بہترین کتاب کے حامل ہونے کے باوجود ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ دنیا بھر کی مصیبتیں اور پریشانیاں مسلمانوں کے لیے ہی کیوں ہیں؟

یہ وہ چند ایک سوال تھے جو علی کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کی دماغی صلاحیتوں کو ماؤف کر رکھا تھا۔ وہ اکثر رات کو پڑھتے ہوئے انہی خیالات میں گم ہو جاتا اور اپنی قوم کے حالت زار پر سوچ و بچار کرتا۔ لیکن اس کی ذہنی پیچیدگیاں مزید بڑھ جاتیں جب وہ اخبارات کی شہ سرخیوں پر غور کر کے روز کے قتل، ڈاکے، چوریاں، راہ زنی، عصمت دری، فریب، دھوکہ دہی اور کئی طرح کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی واقعات اس کی سوچوں کا محور بن جاتے۔

وہ اکثر سوچتا کہ کیا ہم انہی واقعات کو اپنی گود میں لیکر اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھیں گے۔ ہمارا پیارا وطن جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا کیا اس میں اسی طرح اسلام کے نام پر اقتدار کے کھیل کھیلے جائیں گے؟ کب تک نام نہاد علمائے اکرام اسلام کے نام پر اپنی دوکان چمکاتے رہیں گے؟ کیا یہ وطن یونہی شیعہ، سنی فسادات کا مرکز بنا رہے گا؟ ملّا آخر کب تلک اس کے جسم سے لہو نچوڑتے رہیں گے؟ یہ سوچ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا کہ پچھلے اڑتالیس سالوں میں نہ جانے کتنے گھرانوں کے چراغ ملّاؤں کی اس تنگ نظری کا شکار ہو چکے ہیں، نہ جانے کتنی ماؤں کے لال اس آگ کی بھٹی کی راکھ بن چکے ہیں۔ ملّاؤں کی اس ضد اور مفاد پرستی نے ہمارے ملک کو تباہی کے کنارے پر لاکھڑا کیا ہے۔ اور ہم لوگ ایمان سے بہرہ ور ہو کر بھی کفر کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

علی کے ذہن میں قرآن مجید کی وہ آیت گھوم جاتی ہے جس میں ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ۔

جو قوم بھی ایمان سے بہرہ یاب ہو کر پھر کفر کی روش اختیار کر لیتی ہے تو فلاح و بہبود کی راہ اس سے گم ہو جاتی ہے۔ (1/108)

علی یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا کہ ہمارے سادہ دل لوگ آخر کب تلک جھوٹے پیروں کے پھندے میں پھنسے رہیں گے۔ اور اپنی محنت سے کمائی ہوئی دو وقت کی روٹی میں سے بچا کر ان کے پیٹ کا دوزخ بھرتے رہیں گے۔

تعویذ گنڈے سیکھنے (اور کرنے) والوں کو، اس سے کچھ دنیاوی مفاد ضرور حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن دیکھا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس میں ان کا ہی نقصان ہے۔ اس لیے کہ اس سے انہیں دنیاوی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ جو شخص جان دیکر جسم کی لذتیں خریدتا ہے اس کی تجارت، نفع کا سودا کس طرح قرار پا

سکتی ہے۔ اے کاش! یہ اس قدر کھلی ہوئی بات کو سمجھ سکتے۔ (1/102)۔

وہ سوچتا کہ کب تلک ہم لوگ صوبائی عصبیتوں کے جال میں پھنسے رہیں گے اور اپنی ذات کو مزید تقسیم در تقسیم کے عمل سے گذارتے رہیں گے۔ وہ اک انکھیال سے لرز اٹھتا۔

قومیت کے تنگ دائرے میں رہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ انسانیت کی وسعتوں میں پھیل جانے سے اس کا جتھہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے (29/25)' لیکن تم نے ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود پر تمہارا ایمان کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ خدا کے قانون کے مطابق چلنے سے انسان تخریبی قوتوں سے محفوظ رہتا ہے اور اسے سامان نشوونما بھی بافراط ملتا ہے (1/143)۔

علی اپنے اردگرد جاری زندگی کی بے مہار دوڑ کے بارے میں بھی مغز ماری کرتا کہ آخر کب تک ہماری دنیا ایک جہنمی معاشرے کا نقشہ پیش کرتی رہے گی۔ کیوں نہ ہم قرآن مجید کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کر کے اس معاشرے کی بنیاد رکھیں کہ جو جنتی معاشرے کی عملی تصویر ہو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

اب (قرآنی نظام کے قیام سے) وہ دور جلد آنے والا ہے جس میں کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کیے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی (6/165)۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گا۔ نہ ہی کسی سے اس کے جرم کے معاوضے میں کچھ (رشوت) لے کر' اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی مدد کو پہنچ سکے گا (1/48)۔

قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

اس ٹکراؤ میں اس جماعت کے لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں جو قوانین خداوندی اور زندگی کی بلند اقدار کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے۔ اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے۔ اے رسولؐ تو انہیں خوشخبری دیدے کہ ان کے لیے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے گا۔ جس کی شادابیاں سدا بہار اور جس کی آسائشیں زوال ناآشنا ہوں گی (1/25)۔ اس زندگی میں بھی خزاں نادیدہ بہاریں اور بعد کی زندگی میں حیات جاوید۔

وہ اپنے معاشرے سے چمٹی پستی اور غیر اخلاقی قدروں پر غور کرتا تو اس کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے کہ جس میں پیار و محبت اور باہمی الفت کے جذبات کا نام و نشان نہیں۔ معاشرے میں افراتفری کا عالم ہے۔ ہر طرف کھینچا تانی جاری ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ روز کے اخبارات ہماری اخلاقی پستی کی ایک نئی تصویر پیش کرتے ہیں۔ عصمت دری کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ لوگوں کی جان و مال محفوظ نہیں ہے۔ غنڈے کھلم کھلا دندناتے پھر رہے ہیں۔ ہمارے قانون میں اتنی سکت نہیں ہے کہ انہیں لگام دے سکے۔

ان سوالوں نے علی کی رات کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ عجیب صورتحال سے دوچار تھا۔ اس کے اپنے خیال میں ان تمام سوالوں کا جواب بہت ہی آسان اور سہل ہے۔ اور وہ صرف قرآن مجید میں بتائے ہوئے سنہری اصولوں میں پوشیدہ ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر کون اس سمت قدم بڑھائے گا کہ جو انسانیت پر ٹوٹنے والے ظلم و تشدد کے ہاتھ کو روک سکے اور لوگوں کو جہنمی معاشرے سے نکال کر ایک جنتی معاشرے کی طرف رواں دواں کر دے۔

یہ چیز تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق چلنے سے انسان تخریبی قوتوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور اسے سامان نشوونما بھی باافراط ملتا ہے۔ لیکن جہاں تعصب اور ضد کارفرما ہو وہاں دلیل و برہان کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔

پاکستان میں

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
1- ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	ہر روز	عندا لطلب
2- ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: مسز گل بہار	منگل	3 بجے
3- ایبٹ آباد	K/355 کنج روڈ۔ رابطہ: غلام مصطفیٰ اعوان	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
4- بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر5۔ رابطہ فون:2438	پہلا اور تیسرا جمعہ	10 بجے صبح
5- پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔ رابطہ: 270737	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
6- پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
7- پیر محل	مکان نمبر 139/140- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	9 بجے صبح
8- پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے سہ پہر
9- جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد' جی۔ ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	6 بجے شام
10- جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
11- چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
12- چک 215 ای۔ بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
13- حیدر آباد	گولڈن سینٹری' عثمان آباد	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
14- حیدر آباد	B-12 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
15- ڈی۔ جی خان	بلاک G- کچہری روڈ' رابطہ انیس الرحمان فون: 61519	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
16- رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق' مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	10 بجے صبح
17- راولپنڈی	بمقام 4385/47-E اپر سٹوری ہائی وے آٹوز نزد پل لئی گوا لمنڈی راولپنڈی فون: 74752	جمعۃ المبارک	4-30 بجے شام
18- سرگودھا	60- اے سول لائنز' ریلوے روڈ۔ رابطہ فون: 720083	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
19- سیالکوٹ	محمد افضل خلجی' ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: 263252	پہلا اور دوسرا جمعہ	8 بجے صبح
20- فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون: 720096	ہر جمعۃ المبارک	5 بجے شام
21- کراچی	چمن زاہد 19- بی بلاک 13- ڈی گلشن اقبال مقابل اردو سائنس کالج رابطہ خالد گل فون: 539798	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
22- کراچی	مکان 16 گلشن مارکیٹ' 36/C ایریا کورنگی 5 رابطہ: محمد سرور' فون: 312631	جمعۃ المبارک	11-30 بجے صبح
23- کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ ایاز حسین انصاری رابطہ فون: 4571919	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
24- کراچی	برمکان محمد یونس 1206- گلی 10- اے' 36-G شریف کالونی۔ لانڈھی رابطہ: فون: 312631	اتوار	8 بجے شب
25- کوہاٹ	برمکان شیر محمد' نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
26- کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ	جمعۃ المبارک	4 بجے سپہر
27- گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ' سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
28- گجرات	مرزا ہسپتال' کچہری روڈ	جمعرات	3 بجے
29- لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
30- لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	جمعۃ المبارک	بعد نماز مغرب
31- ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
32- مامون کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک 509 گ ب	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
33- اوکاڑہ	برمکان میاں محمد سعید مکان 116 گلی 6 سیٹھ کالونی نمبر 2 رابطہ فون: 3660	ہر جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
34- واہ کینٹ	برمکان محمد داؤد' کوارٹر نمبر 19E/119	بدھ	بعد نماز عصر

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی دستیاب ہے۔
تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔
جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن، جز بقرآں زیستن

اقبالؒ

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Parwez (r)

BOOKS AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THE FOLLOWING PLACES.

1. **CANADA**
   716 The West Mall,Suit 1804
   Etobicoke, ONT (416) 620-4471 — First Sun 11AM

2. **DENMARK**
   Herninggade 8.st th.,
   2100 Copenhagen 0 — Last Sat 2 PM

3. **KUWAIT**
   Flat No. 6, Floor No. 3
   Taher Bu Hamad Building Oppsite Al-Othman Mosque,
   Hawally, Kuwait — Friday 5.PM

4. **NORWAY**
   Akeberg Veien-56, Oslo-6
   Galgeberg, 4th floor — 1st Sun 4PM

5. **UNITED KINGDIM**

   (i) Birmingham
   229 Alum Rock Road — Sunday 3PM

   (ii) London
   76 Park Road Ilford Essex
   Phone 081-553-1896 — 1st Sun 2:30PM

   (iii) Yardley
   633 Church Road, Yardley, Birmingham
   B33 8HA (Phone 021-628-3718) — Last Sun 2PM

   (iv) Essex
   50 Arlington Road, Southend-on-Sea
   ESSEX SS2 4UW, Phone 0702-618819 — 2nd Sun 3PM

   (v) Yorkshire
   Cardigan Community Centre
   145-49 Cardigan Road LEEDS-6
   Contact M. Afzal Phone 0532-306140 — 1st Sun 3PM

Dars-e-Quran
Oslo (NORWAY) — Thursday 21:00PM

طلوع اسلام کی دلی تمنا ہے

کہ

طلوع اسلام کا ہر رکن

قرآن کریم کے احکام کا جیتا جاگتا عملی نمونہ ہو۔ ہر عمل میں' ہر فعل میں' وعدہ وعید میں یاس اور امید میں' کامرانی کی تجلیات میں' ناکامی کی ظلمات میں ہمارا قدم قرآن کریم کی

------- صراط مستقیم سے ہٹنے نہ پائے -------

طلوع اسلام کا ہر رکن

اپنے گاؤں میں اپنے شہر میں ہر آدمی سے منوائے کہ یہ آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ یہ **طلوع اسلام کا رکن ہے**۔ یہ دھوکا اور فریب نہیں دے سکتا کیونکہ یہ **طلوع اسلام کا ممبر ہے**۔ یہ رشوت' حرام اور دوسروں کا مال نہیں کھا سکتا کیونکہ یہ **طلوع اسلام کا خریدار ہے**۔ یہ بے حیائی کا فعل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ **طلوع اسلام سے وابستہ ہے**۔ **اگر** یہ سعادت ہم میں سے کسی کو نہ ملے تو یہ اس بات کی شہادت ہو گی کہ نہ ہمارا عمل قرآنی ہے اور نہ تحریک طلوع اسلام سے ہمارا کوئی تعلق ہے۔

ہر آنکہ کشتہ نہ شد از قبیلہ مانیست

ادارہ طلوع اسلام

Gradually, the base sentiments of self-conceitedness, bigotedness, self-esteem, nepotism, tribalism, feudalism etc. held sway over state craft and changed the caliphate to monarchy once again. The Muslim Society anywhere has no real reformer thus far so that the semblance of "Khilafat-e-Rashida" could be re-established. If at any stage of history, some positive move in this behalf was ever evidenced, the evil forces combinedly forged a common front against such an endeavor and frustrated the noble design. The basic pre-condition to achieving an Islamic way of life is to bring about a mental revolution in the society which is possible only through proper education. Whether such a wishful thinking will ever materialize and which Muslim country would get the credit for making a pioneering effort in this behalf, is shrouded in the mist of future. How wonderful it would be if the God-given State of Pakistan proves the first drop of rain after a long, hot and dry spell spread over centuries. `Amen'

With the establishment of Islamic Welfare States in Muslim countries, the curse of `Riba' (interest) will vanish completely and their mutual trade and commercial relations will develop in an atmosphere of interest-free banking. Nevertheless, the Muslim countries will have little choice to completely do away with interest in their deals with non-Muslim countries and such other international financial institutions, although there will be plenty of scope to bypass the element of interest through barter deals. Consequently, there appears to be no harm in accepting interest as an unavoidable tool in our economic and financial relations with non-Muslim Governments and institutions. Such a measure necessitated by exigencies of time should be backed through the mechanism of "Ijtihad" by a Council constituted by Muslim countries composed of renowned scholars of thought and jurisprudence.

It is ardently expected that the establishment of Islamic Welfare States in all the Muslim countries and the positive results flowing therefrom, will pave the way for other countries of the world to come in the fold of Islamic System, and most probably that will be the period of progress, prosperity and tranquillity about which God has said in His Holy Book `Quran' that this earth will glitter with the Divine Light meaning thereby that "Good" will prevail and "Evil" will disappear for ever. (Verse 69, Surah `Zumur', Para 24).

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ....

viz. food, clothing, shelter and will include education, health-care and all other pre-requisites that help every member of the Society become a useful and a productive citizen. Just imagine a Government that may take upon itself not only the individual needs of the entire Society but also their worries and aspirations. How peaceful will be the atmosphere, free from fear and hunger where every one will be able to work with utmost concentration; when no one will be able to plunder the fruits of other's labour; when there will be no surplus wealth with anyone and hence complete absence of exploitation; all means of instigating and nourishing crime will be gone; the curse of interest or `Riba' will be automatically eliminated. In fact, `Riba' and law of inheritance are essentially measures of transition period. These will not remain relevant in an Islamic Society where possessions of individuals and families will be confined to things of daily use. In other words, the list of personal belongings will continue to expand and shrink, depending on the levels of prosperity obtaining during different periods.

It may occur to an outsider that an Islamic System as advocated above, centralising all resources, is just like Socialism. Islam came some fourteen hundred years ago and being a fore-runner, can influence the ideologies emerging subsequently and not vice versa. The factual position is that the Ideology of Socialism is the product of experience over time which again is the result of trial and error rather than seeking guidance from Islam. It is for this reason that Russian Socialism not only failed to set up a viable welfare state but also surrendered itself at the altar of Capitalism. The sad end of socialism is in accordance with the Divine prophecy that falsehood will vanquish and truth will prevail ultimately. The day is not far when capitalism will likewise crumble down.

In a way, the failure of socialism in Russia in fact is due to the inability of those who had been at the helm of affairs to implement it properly. The so called socialistic system prevalent in Russia was in fact governance by the band that consisted of members of Communist Party and the so-called proletariat who constituted brute majority had practically no share. Similarly, in the so-called democratic society, the real rulers are capitalists whose interests only are safeguarded and the masses remain engrossed in earning their daily bread. The conditions in developing countries like Pakistan are much worse as in their cases, the bureaucracy and the class of landlords join hands with capitalists. The sad story of Islam not having been able to establish its supremacy stems from the inability of those at the top to maintain or sustain the tempo and thrust which the God's Messenger and his first four Caliphs had provided.

stressed in the Quran time and again, describing it a characteristic of "Muttaqeen" ( ) as an attitude and a way of life. "Muttaqeen" are those among Believers who best guard the Divine Will and display their benevolence in spending out of what God has given them. Please refer to verse 2, Sura Baqara, Para 1). As regards the limit for such spending in God's name, it covers one's entire possession surplus to one's own requirements (verse 219, Sura Baqarah, Para 3). This function would devolve on the State if it is Islamic and not on individuals. Since the State will be responsible for all needs of the Society, wages and salaries are likely to be so determined to leave hardly any margin for surplus. However, if in such an eventuality there may still be a margin of saving, some sort of mechanism will be available to set aside or to channelise such marginal surpluses which will voluntarily be surrendered by individuals having been disciplined in an Islamic way of life. In the absence of an Islamic State, the savings of individuals may be expended in the manner Quran has laid down for such situations. Verse 215 of Sura Baqarah (Para 2) specifies the purposes for which the expendable surpluses are to be utilised.

...... قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَ الِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ
السَّبِيْلِ......

The group of beneficiaries mentioned here consists of parents, near relatives, orphans, wayfarers and socially deprived individuals. What verse 208 of the same Surah (Baqarah Para 2) states is of fundamental importance in the context of socio-economic order, of Islam.

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً

It enjoins upon the believers (Momineen) to enter the domain of Islam wholly and completely i.e. neither half-heartedly nor piece-meal, as is being done at present through the introduction of "Ushar" and "Zakat" (not applicable to the entire population), renaming the interest as profit, establishment of a Federal Shariat Court which in a way is a parallel set-up with the traditional Courts of Justice known as High Courts and Supreme Court. Let us ponder to consider what we are aiming at through this patch-work. In fact, it is an attempt to deceive ourselves as if we are under the cover of an Islamic cloak serving the cause of Islam, although we are otherwise living in a completely capitalistic system. This hypocritic stance is a deviation from the right path.

The above references do provide a broad outline of Islam. The sphere of responsibilities of the Government of an Islamic Society will transcend the traditional basic necessities of life,

appears in the form of vegetation, rivers, mountain, plains, deserts stones etc. but it also includes the treasures buried underneath. Thus, all natural resources spread in its vast expanse and unfathomable depths constitute national wealth and possessions belonging to the community as a whole.

Let us consider objectively the productive capacity of labour and its relationship with reward. It is not an uncommon observation in the present day world that there are individuals who put in excessive hard work, yet can hardly meet the bare necessities of their own and their families. On the other hand, there are persons who either work very little or not at all but they have all the comforts of life. Such an anomalous situation exists because division of and compensation for labour are not based on the Islamic principals of justice and equality. This second group of people consisting of apparently more favoured individuals constitute the bunch of social parasites. Conceding that individuals do differ in their respective capacities to work, the compensation to less productive individuals at least be sufficient to meet their basic necessities of life. The criterion in this regard should be `from every one according to his capacity and to every one according to his need'. It is true that just as individuals differ in their capacities and natural inclinations to work, their requirements of life may also differ in the nature and range of wants. The society has, therefore, to keep in mind such varying circumstances. Moreover, the human beings are not only multiplying in numbers but due to spread of education and ever-changing technologies, the productivity and with it the complexities of life are also increasing. It is a fact that responsibilities of a modern Government have increased manifold for the fulfillment of which, more resources are required. Hence it is imperative that the Government which is required to look after the individual and collective necessities of the society, has at its disposal all the resources, natural as well as created. according to Quranic verse 111 of "Sura Tauba" in Para 11, Allah has acquired the right over their (Momins') bodies and possessions for Paradise (promise of a better life here and hereafter.). Quranic way of expression is that when God makes a demand from humans, it does not mean that he demands this for His own sake but rather for the human society through which His Dictates are implemented.

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

"Infaq" (انفاق) is a Quranic term which means to give out to others from your own earnings/possesions, to spend on others (needing help.) or to keep one's wealth/resources open to others. This approach has been

to consider it in the context of and as an integral part of the overall Islamic System. Hence the correct approach should be to introduce Islamic System first; then and then alone each issue will get its rightful place in the overall set-up, yielding its natural and constructive results.

The first State founded on the tenets and principles of Islam which the world witnessed, was that set up in Madina by the last Messenger of God, "Muhammad" (PBOH). This continued during the periods of his first four Caliphs, popularly known as "Khilafat-e-Rashida". Thereafter, the system virtually changed into monarchy, gradually allowing incursions from other ideologies, thus polluting it with worldly exigencies. Quran itself provides the foundations for an Islamic Socio-Economic Order. If a human society as a political entity organises itself by taking guidance from Quran in all its affairs so that social and economic inequalities disappear, a proper base has supposedly been provided to build up the edifice of an Islamic Welfare State. Such a sublime goal cannot, however, be reached merely on wishful thinking and desires howsoever noble these might be. Every member of such a society in his individual capacity and in his relations with others has to act and behave like a true Muslim. In other words, the society in collective terms has to take bold and fateful decisions; great sacrifices have to be made; heavy odds and obstacles have to be overcome; positive and constructive steps have to be taken; the whole society has to be disciplined and tuned to following fundamentals of Islam etc. etc.

The first and foremost concern should be to organise educational system incorporating Islamic values, leading to a mental revolution in the society. Such a desirable situation will certainly prevail if individuals become brain trusts of Quranic principles; human minds are bereft of vices like bias of any type, bigotedness and sectarian, clannish or class feelings. Further, it may become virtually impossible to attain high status or occupy a position of eminence simply on the basis of wealth, favour or nepotism. On the contrary, such an approach will not only be discouraged but will also be looked down upon.

God is Creator of the entire Universe. Land and other resources of Earth cannot, therefore, become personal possessions of individuals and group of individuals. Quran states at a number of places that Earth belongs to God and that it is a source to sustain all types of life, ie. it provides life-sustaining products to all living creatures. Thus, Earth can be held and managed collectively for the benefit of the entire society. It should also be well understood that earth is not merely what it superficially

rent, wages, interest and profit. Land and labour do figure in the production process but are subservient for their utilisation to labour and entrepreneur, the latter also is a kind of specialised labour. Accordingly, the various acts that add value to products and consequent increase in their demand, are different facets of labour itself. Labour occupies a pivotal position in Carl Marx's Theory of Surplus Value. In fact, the four factors of production claiming their respective shares in the resulting value added is a subtle way of appropriating the maximum of divisible pool by the capitalist who besides using these factors of production, also owns them. In this manner, the weakest of these factors, i.e. labour continues to be exploited in the capitalist system.

'Man's share is proportionate to his effort' is the gist of what verse 39 of Sura "Najam" in Para 27 purports to convey.

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى

As regards the question whether the two terms Riba and interest reflect the same situation or are mutually exclusive, we should again derive guidance from Quran. Reference is invited to verse 275 of Sura Baqara in Para 3.

.....وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا

Clarifying the misconceived notion that trade is analogous to Riba, it is categorically stated that while trade is "Halal", Riba in "Haram". This is because human effort (labour) is involved in the case of trade. A little further, verses 278 and 279 of the same Sura convey by implication that the additional charge for loaning out capital is what constitutes Riba. These verses enjoin upon the believers to give up what remains of Riba and refusal to do so would invoke wrath of God and his Messenger. Further, if they submit to God's Will, their demand should be confined to the return of their principal (and nothing over and above that). Thus, neither they will exploit others nor any excesses will be perpetrated on them. These verses make the concept of Riba abundantly clear and make no distinction, or exception on account of the loan being for personal needs on business purposes; whether the rate of interest is high or low and whether it is simple interest or compound interest. The text of these verses, is as under.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ج وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ج لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○

In every day life, the absence of unanimity on the question of interest has made it controversial. It is apprehended that difference of opinion in many other matters is likely to crop up when we try to solve it on individual basis, considering it in isolation. The right course would be

"interest" in English and both fulfill the implications of "Riba" in Arabic. Interest is a fundamental tool of Capitalistic economy in financial dealings and since our economic set-up is similar, some quarters try to justify the existence of interest by saying that interest these days has taken the form of bank interest which by virtue of its link with trade and commerce, does not quite resemble with Riba. This is a gross misconception. It may be noted that any addition to the principal amount will come under the purview of Riba, whatever the connotation.

We should bear in mind that God is `All Knowing' and he certainly knew that a time will come when the borrowing will mostly be for commercial purposes and if God wished to draw a line between the two types of borrowing, i.e. commercial debts and debts for personal wants, he would have undoubtedly used different terms to describe the two situations. Contrary to this, the retention of one and the same term proves that Riba applies to all situations irrespective of the purpose of loan and the rate charged for the use of capital. What distinguishes Riba from trade is the element of human effort, physical or mental, implicit in the latter. In fact there is no ambiguity surrounding the two terms of Riba and interest which are inter-changeable and are not mutually exclusive.

In Capitalism, interest is considered reward of capital and despite a long journey through time assuming periods of laisez faire, mercantilism, classical, neo-classical and now the modern economics, interest has not lost its intrinsic characteristic and basic position in a capitalistic set-up. As regards reward or compensation, this is relevant only in the case of labour, whether physical or mental. Capital in any form is an inanimate substance, capable of doing nothing or bringing about no change by itself unless man applies his know-how. How can such a substance claim its share or compensation? If we ponder, it will not be difficult to comprehend that capital available at present is nothing else than that part of labour's compensation which was saved. In other words, the capital we call interest-bearing or which is productively utilised, is in fact that surplus wealth or capital which is accumulated over time from the pool of unspent earnings in the form of savings. Since capital can assume different forms, e.g. land, orchards, houses and buildings machinery and implements etc., income accruing therefrom is a kind of Riba and hence unjustifiable.

Traditionally, there are four factors of production, viz. land, labour, capital and organisation which participate in the production process and are claimants in the value added. Their shares respectively are known as

mishandling of which resulted in the secession of East Pakistan which became an independent country by the name of Bangla Desh in 1971. This was a heart-rending episode to Pakistani Nation as a whole. The present unanimously agreed Constitution of 1973 goes to the credit of elected representatives at that time. This Constitution also did not have smooth sailing. It received jolts when another Martial Law was clamped on the country. Although the Constitution was not formally abrogated, in practice it became subservient to Martial Law Regulations and Orders. Thus, it virtually remained suspended. Strictly speaking, none of the Constitutions can be termed as Islamic. Adoption of Objectives resolution and a few more nominal provisions relating to the so-called Islamisation can be a source of consolation to some who look at Islam only superficially.

The circumstances in which Pakistan came into being were unusual and the conditions which the great upheaval had created, could have been turned into a blessing, being so conducive that the society could be moulded in any shape that the people at the helm of affairs would have wished. Sadly and to the misfortune of people at large, no use was made of the opportunity which nature had offered.

During the last two decades, some clamour has been witnessed from various quarters in favour of bringing about changes in the prevailing system, conforming to Islamic way of life. Certain steps have also been taken by the Government, giving semblance of introducing Islam through the creation of some Institutions, viz. Council of Islamic Ideology, Federal Shariat Court, Zakat and Ushr, interest-free baking etc. Whether these measures have succeeded in creating the desired impact, is debatable or rather too early to evaluate. We need to bear in mind that adoption of Islam has to be in toto and not piece-meal, as is being attempted presently. Quranic verse 208 in Sura "Baqara" clearly describes this approach.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً

In other words, the positive results of Islam would appear only when the Social Order is completely in conformity with the injunctions of Quran.

The preceding introduction seemed necessary before coming on to discussions about "Riba" vis-a-vis interest. It is now intended to get acquainted with the implications of Riba, like warning about the pitfalls it implies and pointing out the forms it may take. The term "sood" (سود) in Urdu is synonymous to the term

INTEREST AND "RIBA"

A COMPARATIVE STUDY

By

Sirajuddin Ahmad

The motivating factor for waging struggle by the Indian Muslims during Pakistan Movement was to carve out a separate homeland for themselves with a view to set up an Islamic State where they could shape their destinies in the light of Quranic injunctions. When their struggle successfully culminated in the establishment of Pakistan, the widespread communal riots and disturbances which erupted in the wake of partition of South Asian sub-continent resulted in the death of millions and untold miseries to those who survived. Consequently, the shift of population on a large and unprecedented scale confronted the new-born State with the gigantic task of rehabilitation which forced the Government to detract its attention from the main aim at least for the time being.

The sad demise of the Father of Nation, Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah on 11 September 1948, only a year after the creation of Pakistan on 14 August 1947 dealt a big blow to the Nation and a set-back to the Government in the disappearance from the scene of one of the main architects of Two Nation Theory. It had a damaging effect on the proposed plan of work towards the formation of an Islamic Society. Speeches, writings and sayings of Quaid-e-Azam on different occasions had made it abundantly clear that he had a vivid picture of the broad framework for an Islamic State. His aides, companions and successors seemed to have neither the will and conviction nor the perception of an Islamic State. The people at large had started entertaining apprehensions in this direction. The subsequent events and developments proved that such fears were not unfounded.

The process of constitution making moved at snail's pace. So far, we have had three Constitutions. The first one came almost nine years after Independence but it was rescinded after the promulgation of Martial Law in 1958. The 1962 Constitution was a sort of an innovating experiment during the Martial Law Regime. It ultimately led to political strife, the